آئینِ پاکستان

اور

اسلامی جمہوری ریاست کے خدوخال

ادارہ امن وتعلیم کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تربیتی ورکشاپس سے
مفکرین، علماء اور دانشور حضرات کی گفتگو کا خلاصہ

مرتب: مجتبیٰ محمد راٹھور

PEACE & EDUCATION
FOUNDATION

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب: آئین پاکستان اور اسلامی جمہوری ریاست کے خدوخال
مرتب: مجتبیٰ محمد راٹھور
معاونین: غلام مرتضیٰ، زاہد امین
صفحات: 120
ناشر: ادارہ امن وتعلیم
ایڈیشن: پہلا ایڈیشن
پرنٹر: مکتبہ فاروق، محلّہ جنگی قصہ خوانی بازار، پشاور
تزئین: زی گرافکس

فون نمبر:+92-51-2225578
پی او بکس نمبر:1827
mail@pef-global.org
pef-global.org

فہرست مضامین

تعارف ۵

۱۔ جمہوریت اوراس کے بنیادی عناصر ۷

۲۔ اسلام اور جمہوریت: کیا مطابقت ممکن ہے؟ ۲۷

۳۔ اہم جمہوری اقدار: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ۴۵

۴۔ مذہبی آزادی کا تصور ۵۰

۵۔ آئین پاکستان اوراسلامی تعلیمات ۶۷

۶۔ جمہوریت اور جمہوری اقدار کے فروغ میں علمائے کرام کا کردار ۹۴

۷۔ اسلام میں ووٹ کی اہمیت ۹۸

۸۔ بین الاقوامی قوانین ومعاہدات اوراسلامی تعلیمات ۱۰۱

۹۔ بین المسالک ومذاہب مکالمہ، مفاہمت اورآداب اختلاف ۱۰۶

۱۰۔ بنیادی انسانی حقوق ۱۱۸

تعارف

اسلامی جمہوریہ پاکستان، جیسا کہ نام سے واضح ہے، ایک اسلامی جمہوری ریاست ہے۔ پاکستان بننے کے بعد ہی اس نئے ملک کے نظام حکومت اور آئین کے بارے میں تمام سیاسی اور دینی جماعتوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ملک میں نظام حکومت پارلیمانی جمہوریت ہوگا، مگر تمام قوانین اسلامی اصولوں کی روشنی میں بنائے جائیں گے، اسی لیے قرارداد مقاصد کو آئین میں شامل کیا گیا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود ابھی تک ملک میں اسلامی اور جمہوری اقدار کا نفاذ عملاً ممکن نہیں ہو سکا۔ اس ناکامی میں بہت سارے عناصر اور عوامل شامل ہیں، مگر اصل وجہ آئین اور قوانین پر ان کی روح کے مطابق عمل نہ کرنا ہے۔ اگرچہ نظام حکومت و ریاست کے حوالے سے مذہبی اور لبرل طبقات کے مابین اختلاف رائے ہے مگر جمہوری اقدار اور اخلاقیات کے حوالے سے سب کے ایک نظریات ہیں۔ تاہم ان پر عمل درآمد کے حوالے سے تمام طبقات کوتاہی کا شکار ہیں۔ ملک میں ابھی تک عدل وانصاف، مساوات، اجتماعی بھلائی، مذہبی آزادی، قانون کی حکمرانی جیسی اعلیٰ اقدار کو اپنایا نہیں جا سکا۔ آج کے دور کے علماء، مفکرین اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ اس نظام حکومت کی مخالفت کرنے کی بجائے پاکستان کے جمہوری ماڈل کو اسلام کے فلسفہ سیاست، قائداعظم کے نظریات اور علامہ اقبال کے تصورات کے مطابق ڈھالنے کے لیے تجاویز دیں۔ پاکستان کا جمہوری ماڈل اعلیٰ اخلاقی اقدار سے عاری ہو چکا ہے جس کے ذمے دار افراد ہیں جمہوری نظام نہیں ہے۔

ادارہ امن وتعلیم (پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن) اسلام آباد میں قائم ایک غیر سرکاری اور غیر سیاسی تحقیقی ادارہ ہے جو 2009ء سے تعلیم و تربیت اور دیگر تعمیری سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان میں بین المذاہب و بین المسالک ہم آہنگی، تنازعات کے حل اور معاشرے میں قیام امن، رواداری اور بقائے باہمی کے فروغ کے لئے مصروف عمل ہے۔ ادارہ امن وتعلیم گزشتہ چار سال سے پاکستانی معاشرے میں جمہوری

اصول واقدار کوفروغ دینے کے لیے مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام کی استعداد کار میں اضافہ کے لئے تربیتی نشستوں کا اہتمام کر رہا ہے تا کہ وہ عوام میں جمہوری اصول اور اقدار کی آگاہی اور فروغ کو ممکن بنا سکیں۔ ان تربیتی نشستوں کے دوران مذہبی سکالرز، ماہرین اور دانشور حضرات جمہوری نظام بالخصوص پاکستانی نظام حکومت وریاست کے متعلق تربیت فراہم کرتے ہیں۔ کتاب ھذا میں مختلف تربیتی نشستوں کے دوران کی گئی اہل علم وفکر کی گفتگو کو تحریری صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد جمہوریت اور ریاست پاکستان کے نظام کے بارے میں علمائے کرام کو زیادہ سے زیادہ معلومات اور وضاحت فراہم کرنا ہے تا کہ وہ جمہوری اقدار کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

اظہر حسین

سربراہ ادارہ امن وتعلیم

جمہوریت اور اس کے بنیادی عناصر

ڈاکٹر فاروق ستار

سینئر پارلیمینٹیرین وسیاسی رہنما

یہ بہت اچھی بات کہ آپ حضرات یہ کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان کے آئین، پارلیمانی نظام اور جمہوریت کے تصور کو سمجھیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام جو ایک مکمل دین اور مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے اظہار کے لئے قرآن حکیم ایک مکمل کتاب کے طور پر نازل ہوا، اس کو بھی حقیقی معنوں میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں ایک مکمل دین عطا کیا گیا۔ ہماری ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی، سیاسی، معاشی، معاشرتی زندگی ہو یا جملہ قومی زندگی ہو، اس میں اگر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی شعائر اور مذہب کی تعلیمات سے کچھ چیزیں مطابقت نہیں رکھتیں تو ہمیں ان کا جائزہ لینا چاہیے۔ جمہوریت کا یہ لفظ جو مغرب سے آیا ہے ہم اس سے مرعوب ہوں یا خوفزدہ ہو جائیں کہ چونکہ یہ لفظ مغرب سے آیا ہے اس لئے خلاف اسلام ہے یا اسلام میں کسی شوریٰ کا تصور موجود ہی نہیں ہے۔ یا ہم مغرب کے جمہوری تصور کو رد کرتے ہوئے یہ اخذ کر لیں کہ نبی کریم ﷺ نے شوریٰ کا تصور ہی نہیں دیا اور اس کا رواج ہماری تاریخ میں رہا ہی نہیں۔ اگر ایسا ہی ہو تو ہم کہہ دیں کہ ٹھیک ہے ہم لفظ جمہوریت کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ لفظ تو مختلف زمانوں کی ایجاد ہے۔

اگر ہم شوریٰ اور مشاورت کا تصور لیں اور دیکھیں کہ اس کی جدید شکل جمہوری اداروں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، تو ہم یہ جائزہ ضرور لے سکتے ہیں کہ جمہوری ادارے جو قوانین بنا رہے ہیں، جو قانون سازی ہو رہی ہے یا پارلیمان کے اندر جو بھی عمل ہو رہا ہے وہ ہمارے مذہب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ پاکستان میں قوانین کے اسلامی خطوط کی روشنی میں جائزے کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل کا

ادارہ بھی موجود ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے یا اسلام کے نفاذ کے لئے کچھ تحریکیں بھی چلیں، کچھ جگہوں پر اسلامی نظام کے نمونے بھی دیکھنے کو ملے ان کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں مختلف اوقات میں جو فکری معاملات اور مسائل رہے ہیں ان کے بارے میں بھی ہمارے علمائے کرام نے اجتہاد بھی کیا اور ان معاملات پر اجماع بھی ہوا ہے، اور پھر اسی سے کام لے کر اسلام کی از سر نو تعبیر اور تشریح بھی کی گئی ہے۔ تاریخ میں بھی دیکھا جائے جہاں اگر ایسا محسوس ہوا کہ معاشرے اور عوام کے اجتماعی مفاد اور آسانیاں فراہم کرنے میں کوئی سخت اصول یا رویہ رکاوٹ بن رہا ہے تو علمائے وقت نے اجتہاد اور اجماع سے کام لے کر مفاد عامہ کی گنجائش ضرور پیدا کی ہے۔ اگرچہ میرا فہم بھی اس معاملہ میں زیادہ نہیں ہے ، مجھے بھی اصولاً آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کے خیالات اور مؤقف کو بھی سننا چاہئے تاکہ ہم ایک سطح پر رہ کر بات کر سکیں۔ میرا جو تجربہ یا سیکھنے کا عمل رہا ہے میں اس کی روشنی میں بات کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ آپ اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں بات کریں گے یہی مکالمہ ہے۔ مکالمہ اور گفتگو سے ہم ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہوں گے۔ مکالمے اور گفت وشنید سے ہی راہیں کھلتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے مذہب میں مکالمے، مفاہمت اور مصالحت سے نہیں روکا گیا۔ اسی کو Conflict Management یا Conflict Resolution کہتے ہیں کہ اگر کسی معاملے میں اختلاف ہوں یا ان میں شدت ہو تو ہم مل بیٹھ کر مکالمے کے ذریعے مشترکات کو مفاہمت کا ذریعہ بنائیں اور اختلافات کا بہتر حل نکالیں۔ مکالمہ اور گفتگو ہی مسائل کے حل کا بہترین ذریعہ ہیں۔

میرے اپنے خیالات جو میں پیش کر رہا ہوں وہ میرے نکتہ نظر سے قرآن اور اسلامی تعلیمات کے مغائر نہیں ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب بھی مفاہمت میں رکاوٹ نہیں ہے۔ بعض علماء فہمِ مذہب کے حوالے سے بھی شدت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ مذہب کا فہم رکھنا بھی ایسا معاملہ ہے جس میں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی زیادہ قربت، زیادہ علم اور قرآن فہمی عطا کی ہے ان کا تو یہ کام ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو زیادہ قابل فہم اور آسان بنا کر لوگوں تک پہنچائیں نہ کہ اس کو اپنی اجارہ داری سمجھتے ہوئے اس میں اپنا نکتہ نظر شامل کر کے دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کریں جو کہ جبر کی ایک صورت ہے۔ ایسی

صورت حال میں ہمارے جیسے لوگوں کو یہ حوالہ دینا پڑتا ہے کہ ''لا اکراہ فی الدین'' کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے تاوقتیکہ آپ نے دین اسلام کے احکامات مکمل طور پر دوسروں تک پہنچا دیے ہیں۔ دین اسلام کے احکامات کی خلاف ورزی کا نوٹس لینا اسلامی ریاست کا کام ہے۔

ریاست بھی ایک نظام کے تحت چلتی ہے جس میں قوانین ایک طریقے سے بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر آئین کے آرٹیکل 62,63 اور اس کے نفاذ کا معاملہ ہے جس کے مطابق اہلیت کا ایک اسلامی تصور دیا گیا ہے۔ اس میں ایک یہ معاملہ بھی ہے کہ یہ کون طے کرے گا کہ ان آرٹیکل کی روشنی میں کون صحیح مسلمان ہے یا نہیں اور کون اس میں طے کردہ اہلیت کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ یہ مرتبہ اور مقام ہم کس کو دیں گے، اور اس کے لئے معیار کیسے مقرر کریں گے۔ ان ساری باتوں پر ایک مکالمے کی ضرورت ہے۔ ہم مکالمے ہی سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اگر ہم سب اپنے اپنے موقف پر ڈٹ جائیں تو پھر کسی اور طرز کی طاقت کے استعمال کی نوبت آتی ہے۔ اگر دوسرے کے موقف کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے تو شر انگیزی بھی ہوتی ہے اور فتنہ وفساد بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لئے مکالمے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ جمہوریت بھی کوئی آئیڈیل نظام نہیں ہے۔ اس نے بھی ایک بالادست طبقے کی اجارہ داری قائم کی ہوئی ہے۔ ہم بہت کثرت سے پاکستان کی پارلیمان یعنی قومی وصوبائی اسمبلیوں میں یہ دیکھتے ہیں کہ جن کے پاس امارت، دولت وثروت ہے جو نواب، جاگیردار اور وڈیرے ہیں وہ آسانی کے ساتھ پارلیمان میں آسکتے ہیں اور ایک عام غریب واہل کارکن چاہے وہ کسی بھی جماعت کا ہو پارلیمان کی رکنیت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ جہاں عدل وانصاف کے تقاضے سے پورے نہیں ہو رہے، جہاں مساوات نہیں ہے، جہاں تمام افراد کے لئے یکساں مواقع نہیں ہیں، ہم اسے کیسے اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار دے سکتے ہیں، حالانکہ اس سے قبل 1973ء میں تمام مذہبی جماعتیں پارلیمانی جمہوریت پر مبنی آئین کے حق میں ووٹ دے چکی ہیں اور یہ سب کے لئے ایک متفقہ آئین تھا۔

ہمارا یہ یقین وایمان ہے کہ ہمارے مذہب سے زیادہ کسی اور مذہب ونظام میں عدل وانصاف کے قیام پر اتنا زور نہیں دیا گیا۔ تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے آئین یا نظام کے اندر عدل و

انصاف کے ان تقاضوں کی فراہمی کے لئے کہاں کہاں کمی، کوتاہی اور خرابی ہے۔اس کے لئے ہمیں مکالمے، مباحث اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔جیسا کہ دنیا میں ایک لابنگ کا طریقہ ہے اسی طرح ہم بھی اپنی جدوجہد وکاوش کے ذریعے کوئی پریشر گروپ قائم کر سکتے ہیں جو پارلیمنٹ میں جا کر اپنا موقف پیش کرے۔درحقیقت یہ جو 500 خاندان پاکستان کی سیاست پر قابض ہیں وہ اپنے مفادات کے متصادم ہر ترمیم اور تبدیلی کو خلاف آئین اور خلاف قانون قرار دیتے ہیں۔ان کی حمایت کے لئے عدلیہ کا جو کردار ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔آپ پارلیمنٹ کو مشغول کر سکتے ہیں اور لابنگ کے ذریعے اس موجودہ نظام اور موروثی سیاست کے خاتمے کے لئے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

جتنے انتظامی اختیارات اس وقت چیف جسٹس صاحب استعمال کر رہے ہیں یا ڈنڈے کے ذریعے جو اختیارات استعمال کئے جا رہے ہیں وہی اگر وزیراعظم کے پاس ہوں تو کیا صورت ہوگی۔فوج کا ریاستی ادارے کے طور پر جو کردار ہے اس کا یقین، جمہوریت کیا صرف مرکز کی سطح پر قابل قبول ہے اگر اختیارات نچلی سطح پر یا مقامی سطح پر منتقل ہوں جہاں صوبائی اور مقامی جماعتیں اپنا کردار ادا کریں وہ جمہوریت قابل قبول کیوں نہیں ہے۔ان تمام امور پر ہمیں قومی سطح پر مکالمے کی ضرورت ہے۔آئین کے آرٹیکل سات کے مطابق مقامی حکومت یا مقامی ادارے وہ بھی ریاست کا لازمی جزو ہیں، اسے آپ نے کاٹ کر الگ کر دیا تو آپ اس کا کیسے تحفظ کریں گے۔نچلی سطح پر اگر جمہوریت نہیں لائی جاتی تو جو شورائیت اور تمام مکاتب فکر اور تمام علاقوں کے عوام کی شمولیت کا جو جمہوری تصور ہے گویا اس کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔اگر چھوٹے طبقات، صوبوں اور علاقائی سطح پر شراکت اقتدار نہیں ہیں تو یہ ہرگز جمہوریت نہیں ہے۔کسی بھی کمزور طبقے کو محروم رکھنے اور تمام طبقات کو قومی و جمہوری عمل میں شراکت سے دور رکھنے میں جو کمی ہے یا جو بالادست طبقات کی اجارہ داری ہے ان تمام مسائل کے حل کے لئے مکالمے اور تمام طبقات کو مشغول کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پارلیمانی جمہوری نظام کو بہتر اور مزید قابل عمل بنایا جا سکے۔ایک طرف ہم ان خامیوں کے ردعمل کے طور پر اسلامی نظام کی بھی بات کرتے ہیں اور اسلامی شعائر جیسے ہاتھ کاٹنے جیسی شرعی سزاؤں کے نفاذ کی بات بھی کرتے ہیں۔اگر ایک معاشرہ بہت زیادہ غیر مستحکم، بدعنوان اور جرائم سے پر ہو تو کیا شعائر اسلامی کا نفاذ انصاف کے قیام میں معاون

ثابت ہوگا یا نہیں، کیا جبر، طاقت اور تشدد کے استعمال سے بہتری ممکن ہوسکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ تحمل، برداشت اور صبر کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ ہمیں مکالمے کے ذریعے ہی نئی راہیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

نہ گنواؤ نازک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لوتن داغ داغ لٹادیا
میرے چارہ گر کو نوید ہوصف دشمناں کو خبر کرو
جووہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

سوال: ہم یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ جمہوریت کا فلسفہ اور نظام کس بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ طاقت اور اختیارات کی تقسیم کے حوالے سے جو نقائص ہیں وہ صرف پاکستان میں ہیں یا مغربی ممالک میں بھی ایسا ہی ہے؟

جواب:۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسانی تاریخ یا ارتقاء ہے اس میں مختلف اوقات میں مختلف نظام آئے۔ جب مسلمانوں کا عروج رہا یا جن اسباب کی وجہ سے ہم زوال کا شکار ہوئے ان کی پیش بینی کر کے ہم کوئی بند باندھ لیتے یا ان اسباب کا حل نکالنے کی کوشش کرتے اور پیش بندی کرتے، یا پھر ہم شورائیت کے نظام کو بنیاد بنا کر مکالمہ، اختلاف رائے کو برداشت کرنا، مفاہمت کی راہ اپنانے کے عمل کو جاری رکھتے تو آج ہم ہی اس نظام کے علمبردار ہوتے۔ جمہوریت کا لفظ نہ بھی ہوتا اس کی جگہ شورائیت یا اس کی جدید شکل مغرب میں وضع ہوتی تو وہ بھی وہی نظام اختیار کرتے۔ کیونکہ وہاں پر بھی پہلے بادشاہت یا آمریت تھی جس کے ردعمل کے طور پر جمہوریت کا نظام سامنے آیا۔ وہاں شہنشاہت اور اجارہ داری تھی جس کو ختم کر کے وہاں کے لوگوں کو شراکت اقتدار کا اختیار دیا۔ پھر قومی ریاست کا تصور بھی آپ کے سامنے ہے۔ یہ جو اجتماعیت کا تصور ہے کہ لوگ فیصلہ کریں اور لوگوں سے رائے لی جانی چاہئے، ہم بھی اگر پہلے سے پیش بینی کر کے یہ تصور پیش کرتے تو یہ نظام شائد ہمارے ہاں ہی جنم لیتا، لیکن ہم نے زوال کو اختیار کرنا مناسب سمجھا اور شاید ابھی تک زوال سے سبق حاصل نہیں کر رہے۔ مثال کے طور پر مغلیہ دور حکومت میں ہندوستان میں ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان

حکمران تھے۔ دور زوال سے پہلے اورنگزیب نے اس اقتدار کو بچانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد برٹش دور میں ہم اقتدار سے بہت پیچھے چلے گئے۔ دور غلامی کی پسماندگی کے باعث اگر ہم اس وقت جمہوریت ہی کو کلیتاً اختیار کر لیتے ہیں تو بھی ہم مغرب کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔

ہمیں سوچنا ہے کہ ہم کس قدر آزاد ہیں، ہم ابھی بھی IMF کی ڈکٹیشن کے پابند ہیں، ہم IMF کو ڈکٹیشن کب دیں گے۔ ہم معاشی طور پر کیسے مستحکم ہو سکتے ہیں، کیسے عام آدمی کو معاشی آزادی سے ہم کنار کر سکتے ہیں۔ اس وقت کی دنیا میں جو کامیاب نظام ہے وہ جمہوری نظام ہے لیکن اگر ہم اس سے کوئی بہتر نظام وضع کر سکتے ہیں یا موجودہ جمہوری نظام کو مزید کوئی بہتر شکل دے سکتے ہیں تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ موجودہ جمہوری نظام کوئی صحیفہ آسمانی یا حرف آخر نہیں ہے ہم اس سے آگے بھی جا سکتے ہیں۔ اس نظام کو مؤثر، بہتر اور اسلامی شعائر کے زیادہ مطابق بنانے کے لئے اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں تو ہمیں ضرور کرنا چاہئے۔

دوسرا آپ نے مغرب میں جمہوری نظام کے حوالے سے استفسار کیا تو وہاں اختیارات کی تقسیم زیادہ بہتر انداز سے ہے۔ نگرانی اور توازن کا نظام بھی نیچے سے اوپر ہر سطح پر بہت مؤثر ہے۔ اختیار، اقتدار اور وسائل کی منتقلی نچلی سطح پر کی گئی ہے جس کے نتیجے میں وہاں ریاستی ادارے بھی اپنی جگہ پر بہتر کام کر رہے ہیں۔ میرے جو 39 سالہ تجربات کا نچوڑ ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے آئین میں پانچ سے چھ ترامیم ضروری ہیں تا کہ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی انصاف میں جو بھی رکاوٹیں ہیں وہ دور کی جا سکیں۔ سب سے پہلے مقامی حکومت کے نظام کو آئین میں تحفظ دیا جائے۔ آئین پاکستان کا آرٹیکل 140 مقامی حکومتوں کے قیام کی بات کرتا ہے لیکن قانون صوبائی اسمبلی نے وضع کرنا ہے۔ مگر صوبے مقامی حکومتوں کو اختیار منتقل نہیں کرتے جس کے نتیجے میں صرف ایک نمائشی نظام قائم ہوتا ہے جس کی روح موجود نہیں۔ ہم اتنی تعداد میں نہیں تھے کہ اس قانون کو منظور کروا سکیں جبکہ باقی جماعتوں کے لئے یہ قابل قبول نہیں تھا۔ اگر اس کے لئے موبلائزیشن ہو اور یہ اختیار نچلی سطح پر منتقل ہو جائیں تو ہم ملک کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ اگر بلدیاتی اداروں کا انتخاب نہ ہو اور انہیں کام نہ کرنے دیا جائے تو صوبائی حکومت بھی اس قانون کی روشنی میں حق حکمرانی سے محروم ہو جائے اور سپریم کورٹ اسے حکومت کرنے سے روک دے جب تک کہ صوبائی حکومت بلدیاتی اداروں کے انتخابات

کروا کر انہیں اختیارات منتقل نہ کرے۔

دوسرا آرٹیکل 140-A کی رو سے اختیارات اور مالی وسائل ان اداروں تک منتقل ہوں اور ایک مقامی قانون سازی کی لسٹ بنائی جائے۔ آرٹیکل 70 کے مطابق جو پہلے مرکز کے پاس ہے جسے وفاقی قانون سازی کی لسٹ کہا جاتا ہے۔ آرٹیکل 140-B میں صوبے میں حق حکومت بلدیاتی اداروں کی فعالیت سے مشروط ہے۔ ایک اور بڑا مسئلہ وسائل کی منصفانہ تقسیم ہے۔ جو بھی وفاق اور صوبوں کی آمدن یعنی تجارت اور محاصل ہیں ان کی تقسیم آرٹیکل 160 کے تحت قومی مالیاتی کمیشن کرتا ہے۔ وہ مرکز سے صوبوں کو وسائل تقسیم کرتا ہے جس میں 88% وسائل آبادی کی بنیاد پر تقسیم ہوتے ہیں، باقی پسماندگی، رقبہ اور محاصل کی بنیاد پر 12% تقسیم ہے۔ اگر 88% فیصد آبادی کی بنیاد پر وسائل کی تقسیم ہے یعنی صوبوں کو آبادی کی بنیاد پر وسائل ملتے ہیں تو صوبوں سے نیچے بلدیاتی اداروں کو بھی یہ وسائل آبادی کی بنیاد پر تقسیم ہوں۔ یعنی انسانوں اور انسانی آبادی کی بنیاد پر جو وسائل صوبوں کو دیئے جاتے ہیں، آرٹیکل 160 میں یہ بات بھی بذریعہ ترمیم درج ہونی چاہیے کہ وہی وسائل اسی بنیاد پر نیچے بلدیاتی، ضلعی اور شہری اداروں کو بھی منتقل کئے جائیں۔ یہ بڑی ناانصافی ہے جس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ یہ انصاف کا تقاضا ہے اور اگر یہ ترمیم ہو جاتی ہے تو ہم ایک بہترین نظام کی طرف جا سکتے ہیں۔

تیسرا ٹیکس کا منصفانہ نظام ہے۔ وفاقی قانون سازی کی لسٹ جس کا میں نے ذکر کیا ہے کی شق نمبر 7 میں کہا گیا ہے کہ ہر قابل ٹیکس آمدنی پر ٹیکس ہونا چاہئے ماسوائے زرعی آمدنی کے۔ اگر آئین خود ایک شعبہ معیشت اور دوسرے شعبہ معیشت میں امتیاز کرے گا اور ایک شہری اور دوسرے شہری سے الگ الگ برتاؤ کرے گا تو یہ ایک آئینی سقم ہوگا۔ یعنی شہریوں کو یکساں حقوق حاصل نہیں۔ اگر تنخواہ دار طبقے پر 12 لاکھ آمدنی سے اوپر ٹیکس ہے تو ہاریوں اور زمینداروں پر بے شک 25 لاکھ روپے سے زیادہ آمدنی پر ٹیکس عائد کریں لیکن وہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ نہیں ہونے چاہییں۔ معیشت میں زراعت کا حصہ 21% فیصد ہے لیکن ٹیکس میں ان کا حصہ صرف 1% ایک فیصد ہے۔ یہ بھی ایک بڑی اور واضح ناانصافی ہے اگر اسے دور نہیں کیا جاتا تو پھر یہ ناہمواری ہمارے ارتقاء، ترقی، استحکام اور اعتدال میں رکاوٹ ہے۔ اگر یہ اختیارات نیچے بلدیاتی اداروں کو

نہیں دیئے جاتے تو پھر کیا نئے انتظامی یونٹس اور نئے صوبے بنانے کی ضرورت ہے۔ 1947ء سے 1951ء تک جتنے ملکوں نے آزادی حاصل کی ان سب نے آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ صوبوں کی تعداد میں اضافہ کیا، ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوا، نئے انتظامی یونٹس بنانے کا بھی جائزہ لیا جانا چاہئے۔

معاشی آزادی کے لئے بے روزگار افراد اور گھر بیٹھی ہوئی خواتین جو آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں کو معاشی خوشحالی میں حصہ دار بنانے کے لئے چھوٹے قرضے بڑے پیمانے پر دیے جانے چاہئیں۔ ضروری نہیں کہ وہ نوکری کے لئے گھر سے باہر نکلیں، وہ گھر میں بھی اپنی صلاحیت و ہنر کے مطابق کام کر سکتی ہیں۔ تاہم اگر وہ گھر سے باہر نکلتی ہیں تو انہیں معاشی، سماجی اور معاشرتی تحفظ کی فراہمی کے لئے ریاست کی کیا ذمہ داری ہے اسے وضع ہونا چاہئے۔ گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش ہم سے ایک ارب ڈالر کی کپاس خرید کر اس سے تین ارب ڈالر کی برآمدات پیدا کر رہا ہے۔ ایک ارب ڈالر ہمیں دیتا ہے، ایک ارب ڈالر ملازمین اور ہنرمندوں کو مل جاتے ہیں اور ایک ارب ڈالر وہ نفع کما رہا ہے۔ زمین ہماری، محنت اور کپاس ہماری لیکن منافع وہ کما رہے ہیں ہم یہاں وہ کام کیوں نہیں کر سکتے۔

نظام تعلیم میں یکسانیت کی ضرورت ہے۔ مدارس کے نظام میں کیسے جدت لائی جاسکتی ہے۔ دیگر جو نظام ہمارے ہاں رائج ہیں ان میں کیسے بہتری لائی جاسکتی ہے۔ بطور مسلمان ہم امن کے داعی ہیں ہم اپنی دعوت فکر پوری دنیا کو دیتے ہیں لیکن عملاً ہمیں اس کا عملی ثبوت فراہم کرنا ہوگا اور بین المذاہب مکالمے کو بھی فروغ دینا ہوگا۔

راحت ملک

سماجی رہنما و رائٹر

جمہوریت کی بنیادی روح یہ ہے کہ دونوں فریق کسی تنازعہ پر یا کسی ایک مؤقف پر باہمی اختلاف پر قائم رہیں تو اس سے کسی ایک کا نقصان اور دوسرے کا فائدہ ہوگا، لیکن اگر وہ مل کر باہم گفتگو اور مفاہمت کے ذریعے کسی ایک حل پر متفق ہو جائیں تو نہ کوئی ایک فائدے میں رہے گا اور نہ دوسرا نقصان میں۔ تاریخی اعتبار

سے ارتقاء اور جمہوری اداروں پر بات ہوگی یعنی موجودہ دور میں جمہوریت جس شکل میں موجود ہے وہ کن کن مراحل سے گزر کر پاکستان اور دیگر دنیا میں موجودہ صورت میں سامنے آئی ہے۔ جمہوریت کا بنیادی عنصر انسان ہے، دوسرا جس طرح میں ایک انسان ہوں اسی طرح دوسرے بھی برابر کے انسان ہیں۔ جمہوریت ایک ایسا ڈھانچہ مرتب کرتی ہے جس میں تمام انسان برابر ہوتے ہیں ان کے درمیان عقیدے، رنگ، نسل، مذہب اور صنف کے اعتبار سے کوئی تفریق نہیں ہوتی، اختلاف محض سیاسی اعتبار سے ہوگا۔ ہر انسان کو عقیدے، مذہب اور ثقافتی تنوع کے اعتبار سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر۔ بنیادی طور پر جمہوریت انسان دوستی اور انسانی مساوات ہے۔ اس بنیاد پر اگر کوئی سیاسی جماعت، ریاستی نظام اور حکومتی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے تو اسے عمومی اصطلاح میں جمہوری نظم کہا جاتا ہے۔

جمہوریت کی موجودہ شکل یعنی ریاستی جمہوریت کا آغاز تاریخی اعتبار سے ایتھنز کی شہری ریاستوں میں قبل از مسیح ہوا۔ ایتھنز کے نواح کے شہروں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جنہیں ریاستیں تو نہیں مملکتیں کہا جا سکتا ہے۔ نظم حکومت اس طرح سے ترتیب دیا گیا کہ ان کے درمیان حکومتوں کا یا عدالتی نظام طے کرنا ہوتا تو ایتھنز کے آزاد شہریوں پر مشتمل شہری کونسل زیر بحث مسئلوں کا حل پیش کرتی تھی جن میں بادشاہ کا انتخاب بھی شامل ہوتا تھا۔ شہری کونسل جن شہریوں پر مشتمل ہوتی تھی، ان میں وہ آزاد شہری شامل تھے جو غلام نہیں تھے۔ کونسل میں سیاسی و معاشی مقام رکھنے والے اور صاحب جائیداد اور طبقہ امراء سے تعلق رکھنے والے شامل ہوتے تھے، اس اعتبار سے یہ مکمل جمہوری نہیں تھی۔ ان کی رائے اور ووٹ مساوی ہوتے تھے۔ چونکہ ایتھنز میں بسنے والے زیادہ افراد، غلام، محنت کش اور کام کرنے والے لوگ ہوتے تھے لہٰذا وہ ان شہری کونسلوں کا حصہ نہیں تھے اور نہ ہی انہیں رائے دہی یا ووٹ کا حق حاصل تھا۔ لہٰذا ابتدائی جمہوری سیاسی نظم کے طور پر سیاسی تاریخ میں اس کا حوالہ دیا جاتا ہے جو کہ کوئی مکمل جمہوری نظام نہیں تھا، تاہم یہ ایک بنیاد تھی جس پر بعد میں جمہوریت کی بڑی وسیع اور بلند عمارت قائم ہوئی۔

جمہوریت اپنی موجودہ شکل میں کئی مراحل طے کر کے آتی ہے۔ اس کا آغاز ایتھنز سے کیوں ہوا؟ اگر اس کی معیشت اور معاشرت کو مدنظر رکھیں تو وہاں تجارت تھی، پیداوار نہیں تھی، وہ دیگر علاقوں سے اشیاء

لا کر وہاں فروخت کرتے تھے یعنی وہاں پر تاجر طبقہ زیادہ تھا۔ اس میں غلاموں کی تجارت بھی شامل تھی، جمہوریت کا بنیادی تعلق معیشت سے ہے۔ جیسے معیشت بدلتی ہے اس کا سیاسی ڈھانچہ اور نظم تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے کیا یہ حتمی سچائی ہے۔ شاید ایسا بھی نہیں ہے۔ اگر ہم قبائلی عہد کو دیکھیں تو اس میں بھی ایک جمہوری نظم موجود تھا۔ آپ نے ایک مشہور روایت سنی ہوگی کہ پہلے وقت میں بعض ممالک میں اگر کوئی بادشاہ فوت ہو جائے تو لوگ کھلی جگہ پر جمع ہو جاتے تھے اور ایک پرندہ جس کا نام ہما ہے وہ چھوڑا جاتا تھا وہ جس کے سر پر بیٹھ جائے اسے بادشاہ بنالیا جاتا تھا۔ گویا یہ بھی ایک انتخاب تھا مگر یہ انسانی نہیں تھا۔ یہ شخصی و سماجی شعور کی ایک سطح تھی، یہ اسی وقت تک تھا جب تک بادشاہت میں وراثت نہیں آئی تھی۔ ایک صورت یہ بھی رہی کہ قبیلے کے سردار کے انتقال کی صورت میں مشاورت سے نئے سربراہ کا انتخاب کیا جاتا رہا۔ اس میں معیشت کا یہ پہلو شامل تھا کہ تمام قبیلہ مل کر کام کرتا تھا، وسائل مشترک تھے جو باہم برابر تقسیم کر لئے جاتے تھے۔ بنیادی طور پر معیشت کا ہی ڈھانچہ تھا جو تاریخ میں کسی بھی جمہوری نظام کی اساس بنتا رہا ہے۔ آپ اس سے اختلاف بھی رکھ سکتے ہیں لیکن زیادہ تر فلسفہ یا سیاسیات کے ماہرین نے اسی نکتے پر زیادہ زور دیا ہے یا تاریخ سے اس کی تطبیق کی ہے۔

جمہوریت میں اختلاف رائے کا حق ہے۔ اس ضمن میں اسلامی تاریخ میں حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے ایک قول کا حوالہ دوں گا جو جمہوری سوچ اور جمہوری ثقافت کا ایک اظہار ہے کہ اپنی رائے اور فتویٰ کے بارے میں مجھے درست ہونے کا یقین ہے لیکن اس کے غلط ہونے کا امکان ہے گویا کہ اپنی سوچ کو حتمی نہ سمجھنا یا یہ احتمال ہے کہ اگر کوئی اس سے بہتر اور مدلل رائے، سوچ یا شرعی مؤقف سامنے آ سکتا ہے جسے قبول کیا جانا چاہیئے۔ اسی طرح جمہوریت بھی کسی اٹل مؤقف یا سوچ کا نام نہیں ہے۔ اس بات سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے انسانی شعور کا ارتقاء جاری رہتا ہے اور تمام انسان مل کر بھی کوئی حتمی سوچ یا مؤقف قائم نہیں کر سکتے کیونکہ انسانی فکر اور سوچ میں غلطی کا احتمال ہے، وہ اسی خطا سے سیکھتا ہے اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے آگے بڑھتا ہے۔ جمہوری نظام کی تشکیل میں انسان کے معاشی و سیاسی مفاد، سماجی بالادستی، سماجی شعور، علاقائی وطنیت کے مختلف مفادات ریاستی ڈھانچے میں مرتکز ہوتے چلے گئے۔ ان میں انسانی شراکت کو یقینی بنانے کے لئے انسان نے اپنی شعور کی بلندیوں پر جا کر جو جمہوری نظم ترتیب دیا وہ بنیادی طور پر اس بات کا متقاضی ہے کہ اس ریاست

کے لوگ جس بھی جغرافیہ میں ہیں ان کی پیدا کردہ مشترکہ دولت اور ان کے جملہ مفادات، کسی گروہ کے عقیدے، رنگ ونسل ودیگر امتیازات کے مسائل اس طرح طے کئے جائیں کہ کسی گروہ کے مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر انسان ایک دوسرے کے مؤقف کو قبول کریں، تاکہ فتنہ وانتشار سے محفوظ رہ سکیں اور باہم رضامندی کے ساتھ اختلاف رکھنے والے گروہ ایک دوسرے کو قبول کرلیں۔ اس بنیاد پر جمہوری نظم، جمہوریت یا جمہوری اداروں کی تشکیل قرار پائی گئی۔

بنیادی طور پر جب ہم لفظ ریاست لفظ استعمال کرتے ہیں تو کیا یہ سلطنت کے معنوں میں ہے جیسے مغل ریاست یا وہ سیاسی نظم کی ایک ایسی صورت کا نام ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔ آج کے جدید دور میں ریاست کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو ریاست، سلطنت اور مملکت کے الفاظ میں فرق کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر بادشاہت کو سلطنت کہتے ہیں ان کے عوام کو شہری نہیں رعایا کہا جاتا ہے۔ شہری کا لفظ ایتھنز کی کونسل کے افراد کے لئے استعمال کیا گیا، غلاموں کو شہری نہیں تسلیم کیا گیا۔ جدید دور میں ریاست کی تشکیل ایک آئین یا دستور کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس کے باشندے رعایا نہیں رہتے بلکہ وہ شہری بن جاتے ہیں۔ شہری امور مملکت و ریاست کا حصہ بن جاتے ہیں اور اپنے حکمران خود منتخب کرتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق قانون سازی کرتے ہیں اور اس کے لئے مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف عقائد رکھنے والے، مختلف رنگ ونسل اور مختلف علاقوں کے لوگ جب ایک انتظامی ڈھانچے میں جمع ہونے کے لئے ایک یونٹ تشکیل دیتے ہیں وہ سیاسی جماعت کہلاتی ہے۔ آج جمہوریت کا بنیادی آلہ جمہوری سیاسی جماعت ہے۔ اگر کسی ملک میں جمہوری نظام ہو یا اس کا دعویٰ کیا جاتا ہو لیکن یہ نظام اور ادارے کمزور ہوں، آئین موجود ہو لیکن جمہوری رویہ نہ ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بنیادی آلہ یعنی سیاسی جماعتوں میں کمزوریاں ہیں۔ ان کے اندر جمہوریت یا جمہوری مزاج اور رویہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ ریاست کے اداروں میں ایسا جمہوری طرز وانداز اور جمہوری عمل قائم نہیں کر سکے جس کے نتیجے میں ملک کے اندر مثالی جمہوریت قائم ہو یا مثالی جمہوری ریاست تشکیل ہو سکے۔

جمہوریت جہاں اپنے اقدار کے اعتبار سے مستحکم تاریخ اور عملی طور پر قد وقامت رکھتی ہے وہاں کے معاشروں میں چار پانچ چیزیں ایسی ہیں جن سے ہم اتفاق بھی کر سکتے ہیں اور اختلاف بھی۔ اگر ہم امریکہ کو

دیکھیں تو وہ کوئی مثالی ریاست تو نہیں مگر امریکی عوام اور معاشرے میں جمہوری رویے نظر آتے ہیں۔ان کے معاشرے کے اندر دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں اور اس میں سمو جاتے ہیں۔وہ قانونی طریق کار پر عمل کر کے رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق کے بغیر برابری اور مساوات کی سطح پر برابر کے شہری بن جاتے ہیں۔مگر یہ انجذاب ان کی اپنی ذاتی شناخت کو متاثر نہیں کرتا۔ وہاں جمہوری ثقافت پنپتی اور فروغ پاتی ہے۔ ایسے معاشروں میں نسلی، علاقائی یا مذہبی بنیادوں پر مختلف گروہوں کے درمیان تصادم کا امکان کم ہو جاتا ہے کیونکہ معاشرہ اختلاف رائے کو قبول کرنے کے لئے ذہنی طور پر رضامند ہوتا ہے۔ذہن تحمل، بردباری اور انسان دوستی کی تربیت حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔وہاں یہ سمجھا جاتا ہے جو میرے حقوق ہیں، وہی دوسرے کے ہیں لہٰذا اگر میں اپنے حقوق کا تحفظ چاہتا ہوں تو دوسرے بھی وہی حق رکھتے ہیں۔

یہی مثال یورپ کی ہے۔ وہ یورپ جس نے دنیا بھر میں نوآبادیاتی استحصالی نظام قائم کیا، اپنے اپنے معاشروں کے اندر مثالی جمہوری نظام واقدار کا حامل ہے۔ برطانیہ میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ موجودہ وزیراعظم تھرسیامے اگر عہدے سے ہٹ جائیں یا پارٹی ہٹا دے تو زیادہ تر امکان یہ ظاہر کیا جاتا ہے وہاں پاکستان نژاد وزیر داخلہ مسٹر ساجد برطانیہ کے وزیراعظم بن سکتے ہیں۔ برطانیہ میں اس ملک کے شہریوں میں سے ہجرت کرنے والوں میں سے ایک شہری وہاں کا وزیراعظم بن سکتا ہے جو کل اس کا غلام اور نوآبادیاتی رہا ہے۔ یہ عمل جمہوریت کی ایک وضاحت ہے کہ اس کے شہریوں میں برابری اور مساوات کا تصور بہت حقیقی ہے، انہیں بلا امتیاز رنگ ونسل اور عقیدہ ایک جیسا سمجھا جائے، اس کے نتیجے میں سوسائٹی میں جو تنوع پیدا ہو سکتا ہے وہ گلدستے کی صورت میں ہے، یہی جمہوریت ہے۔دستور کی مثال ایک رسی کی ہے جو اس کے شہریوں اور سیاسی جماعتوں کو ایک ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ایسے معاشروں میں اعلیٰ انسانی قدریں اور اخلاقی اور تہذیبی روایات کی معراج دیکھی جاسکتی ہیں، یہی جمہوری اقدار بھی ہیں جنہیں ہم دنیا کی تاریخ، خلافت راشدہ، جدید دنیا کے معاشروں اور قدیم معاشروں کی تہذیب میں بطور مثال دیکھتے ہیں۔خود ہمارے ہاں بلوچستان وغیرہ میں قدیم قبائل میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

پھر جمہوری معاشرہ اپنی حکومت کی طاقت کو بذریعہ آئین وقانون اور رضامندی کے ذریعے اس

طرح تقسیم کرتا ہے کہ اختیارات و طاقت کا توازن مساوی ہو جائے۔ مساوات کی بنیاد عوام کے مختلف گروہوں، قومیتوں اور علاقائی یونٹس کے درمیان اختیارات وریاستی وسائل کی تقسیم ہے۔ 1973ء کے آئین میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ریاست پاکستان ایک وفاقی پارلیمانی جمہوریت ہوگی۔ بدقسمتی سے جو کہا گیا ہے وہ مثالی صورت میں عملاً موجود نہیں لیکن آج چونکہ ہمارا یہ موضوع نہیں لہٰذا بات آگے بڑھاتے ہیں۔

جمہوریت اپنے ارتقاء میں معیشت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ جمہوریت جاگیردارانہ عہد میں زرعی معیشت کی بنیاد پر تھی، پہلے کی سلطنتوں کو بھی دیکھیں تو ہندیا برصغیر، ایران، مصر اور یونان اور روم وغیرہ کی معیشتیں زراعت کی بنیاد پر تھیں۔ بنوامیہ، بنوعباس کی سلطنتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ جب انسانوں نے زراعت سے نکل کر پیداوار کے ایسے ذرائع کے دور میں قدم رکھا جہاں دستکاریوں کا آغاز ہوا، ہنرمند طبقے وجود میں آئے تو ہمیں یہ ضرورت پیش آئی کہ ہم خریداری وغیرہ کے لئے کرنسی کا استعمال کریں۔ اشیاء کے تبادلے کے لئے اشیاء کی بجائے کرنسی کا استعمال کیا گیا۔ سترھویں صدی میں دھات کی یعنی سونے چاندی کے بجائے کاغذ کی کرنسی کا استعمال شروع ہوا۔ کرنسی دولت نہیں وہ دھات پر مبنی تھی، اب دولت کے بجائے کاغذ کو اس کا متبادل قرار دیا گیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فاتح ممالک کا برطانیہ میں اجلاس ہوا جس میں تین ادارے تشکیل دیئے گئے، اقوام متحدہ، جس کا مقصد عالمی تنازعات کا حل کرنا تھا، دوسرا عالمی بنک بنایا گیا جس کا مقصد جنگ سے تباہ حال ممالک کی بحالی اور امداد تھا، ورلڈ بنک، تیسرا ادارہ آئی ایم ایف جس کی عملاً صورت گری کافی عرصہ بعد کی گئی۔ ورلڈ بنک ایک ساہوکار ادارہ بن گیا جو مختلف ممالک کو امداد کے نام پر قرضے دیتا ہے۔ اگر کوئی ملک وہ قرضہ واپس نہ کرے تو وہ آئی ایم ایف کو شفٹ ہو جاتا تھا، ہرگاہک یعنی متعلقہ ملک سے آئی ایم ایف نئی شرائط طے کر لیتا ہے۔

تاریخ کے ارتقاء میں ہم ہنرمند طبقے تک پہنچے تھے، ہنرمند سے اگلا قدم سوداگر تھا سوداگر سے تاجر ہوا اور تاجر سے کارخانہ دار وجود میں آ گیا۔ صنعتی ارتقاء اور صنعتی دور کے آغاز کے ساتھ صنعت کار اور تاجر کے عالمی سطح پر دو بڑے طبقے وجود میں آ گئے۔ صنعت کار سے سرمایہ دار اور سرمایہ دار سے آگے ملٹی نیشنل کمپنیاں وجود میں آتی چلی گئیں اور اب ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی آپس میں اتحاد کر کے ملٹی نیشنل کارپوریٹ بن گئے ہیں۔ اب

جدید جمہوریتوں میں لکھے گئے آئین کے اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس نہیں بلکہ ان کی حکومتوں اور نظام کو پس پردہ ہدایت کرنے والی بڑی معاشی قوتوں کے پاس ہے۔ انہوں نے پوری دنیا کے ممالک میں ایسی معاشی بالادستی اور جکڑ بند کا جال بن رکھا ہے جس سے آزاد ریاست کا تصور مجروح ہوتا ہے۔ گویا یہ درست ہے کہ حاکم وہی ہے جس کے پاس دولت اور طاقت ہے، اس صورت حال کو بدلنے کے لئے دو ذرائع ہیں۔ عالمی مالیاتی اداروں سے یا عالمی معاشی اداروں سے آزادی اور نجات سے تحریکیں چلائی جائیں جیسا کہ نوآبادیاتی تسلط سے آزادی کے لئے تحریکیں چلائی گئیں۔ اس کے بھی دو طریقے تھے، مسلح جدوجہد اور جمہوری جدوجہد، ہندوستان میں آزادی کے لئے دونوں طریقہ کار آزمائے گئے لیکن سیاسی یا جمہوری راستہ کامیاب ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عالمی اداروں کی بالادستی سے نجات حاصل کرنے کے لئے انسانی شرف کو قائم رکھتے ہوئے جمہوری راستہ کی بنیادی اکائی یعنی سیاسی جماعتوں کو صحیح خطوط پر قائم کیا جائے اور سماج کے مختلف مفاد رکھنے والے گروہوں کو ان جماعتوں میں شامل کرتے ہوئے بالادستی کے ان مظاہر سے ٹکرانے کے لئے پرامن سیاسی جدوجہد کی جائے۔ جیسا کہ ہندوستان کی آزادی کے وقت کیا گیا اور کامیابی حاصل ہوئی۔ تو ثابت ہوا کہ جمہوریت آزادی کی طرف لے جاتی ہے، انسانی شرف کو بحال کرتی ہے۔ انسانی مساوات کو تسلیم کرتی ہے۔ معاشی مفادات کی بہتر تقسیم کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور یہ تقسیم باہم رضامندی اور ضرورت یا محنت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں مل کر کسی ملک میں جمہوری نظام حکومت اور جمہوری رویے اور مزاج کی تشکیل دیتی ہیں۔

ہمارے ہاں ابھی جمہوری رویوں اور مزاج کی تشکیل نہیں ہوئی، ہم ابھی تک مختلف گروہ بندیوں میں لڑائی جھگڑے کا شکار ہیں۔ ان جھگڑوں میں مذہبی فرقہ واریت بھی شامل ہے لیکن ان تمام جھگڑوں کی اصل بنیاد معاشی ہے۔ ہمارے ہاں تحمل اور بردباری نہیں پیدا ہوئی یا مثالی جمہوری رویئے تشکیل نہیں پائے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ریاست نے شہریوں سے وہ جمہوری سلوک روا نہیں رکھا جو اس کی ذمہ داری تھی، جس کا تعین 1973ء کے آئین میں کیا گیا ہے۔ ریاست کے آئین میں دیئے گئے شہری حقوق پورے نہیں کئے گئے۔ دوسری طرف سماجی سطح پر پاکستانی معاشرے میں ایک بہت اہم طبقہ ائمہ اور خطباء حضرات ہیں جو

معاشرے میں تحمل، برداشت اور رواداری کے فروغ کے لئے بہت بڑا کردار ادا کر سکتے تھے مگر بدقسمتی سے جو کہ نہیں ادا کیا گیا۔ مجموعی طور پر معاشرے کے اندر عدم برداشت اور انتشار کا جو غیر جمہوری رویہ ہے اس بناء پر ریاست ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ ایک جمہوری ریاست ہے۔

بحث کا اگلا حصہ جمہوری اداروں اور پاکستان کے حکومتی نظام سے متعلق ہے۔ جمہوری نظام میں بنیادی کردار عوامی جمہوری تنظیم یا سیاسی جماعت کا ہے۔ پھر جمہوری نظام کا تقاضا ہے کہ قانون سازی سے لے کر ریاستی وسائل کی تقسیم تک تمام چیزیں منتخب شدہ اداروں کے ہاتھ میں ہوں۔ وہ تین ادارے آئین میں جن کا ذکر کیا گیا ہے وہ لوکل گورنمنٹ یعنی مقامی حکومت پھر صوبائی اور پھر مرکزی حکومت۔ اگر لوکل گورنمنٹ یا مقامی بلدیاتی ادارے نہ ہوں تو ریاست کا ایک جمہوری ستون ٹوٹ جاتا ہے، دوسرا ستون صوبوں کی حکومت، صوبوں کی حکومتیں مل کر وفاق بناتی ہیں۔ ریاست نے اپنی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک پارلیمنٹ یعنی مقنّنہ جس میں عوام کے نمائندے ریاست اور حکومت کو چلانے اور عوام کے مفاد کے مطابق اچھا نظام فراہم کرنے کے لئے قانون سازی کرتے ہیں۔ پھر انتظامیہ جو اس قانون پر عملدرآمد کرے گی پھر عدلیہ ہے جو قانون کے مطابق فیصلے کریں گی۔ عدالتوں سے قبل جرگہ سسٹم تھا لیکن ان کا قانون مرتب شدہ نہیں تھا۔

مقنّنہ انتظامیہ اور عدلیہ ریاست کے تین بنیادی ستون ہیں جو جمہوری ریاست کا بنیادی حصہ ہیں، یہ انہی سطح پر اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مقنّنہ میں قومی اسمبلی اور سینٹ ہیں، قومی اسمبلی میں عوام کے نمائندے براہ راست منتخب ہو کر آتے ہیں، سینٹ میں عوامی نمائندے بالواسطہ طور پر وفاقی اکائیوں کی یکساں نمائندگی کرتے ہیں۔ مقنّنہ میں سے ہی حکومت یا ملک اور صوبے کی ایگزیکٹیو اتھارٹی تشکیل دی جاتی ہے جو انتظامیہ اور انتظامی سٹرکچر، انتظامی اداروں کے ذریعے مرکزی صوبے یا حکومت کو چلاتی ہے۔ عدلیہ میں باہم تنازعات قانون کی روشنی میں تشریح کے لئے پیش کئے جاتے ہیں جن کا فیصلہ عوام اور حکومت دونوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہی تینوں ستون جمہوریت اور آمریت یا بادشاہت میں امتیاز کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید احمد سعیدی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں کرم ہے کہ اس نے ہمیں پاکستان جیسا خوبصورت اور نعمتوں سے معمور ملک عطا کیا۔ کوئی بھی ملک نظام کے بغیر نہیں چل سکتا، قوموں کے بننے اور بگڑنے میں صدیاں لگتی ہیں۔ زوال سیلاب کی طرح ہوتا ہے جس میں نشیب بھی ہے اور فراز بھی یعنی ہر طبقہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ درحقیقت امت مسلم زوال کی زد میں ہے اور اس سے ہر شعبہ متاثر ہے خواہ مذہبی ہو سیاسی ہو یا دیگر شعبہ جات۔ اس وقت جو نظام ہمارے ملک میں رائج ہے وہ جمہوریت ہے اس میں کیا بہتری لائی جا سکتی ہے اس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس کا کوئی متبادل سامنے لانے میں ایک وقت درکار ہے، فی الحال اسی میں بہتری لانے کے لئے تمام اہل علم و فکر، چاہے وہ دینی فکر رکھنے والے ہیں یا دنیاوی، کو ایک کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ انارکی اور انتشار سے بچ سکیں۔ کوئی بھی سسٹم بنانے کے لئے ایک بڑا وقت درکار ہے۔ میرے دوست عطاء الرحمان صاحب پی ایچ ڈی کے لئے ہالینڈ گئے تھے، یہ وہاں انتخابات کا مشاہدہ کر کے آئے ہیں جو کلیتاً سیاسی شعور کی بنیاد پر منعقد ہوتے ہیں چودھراہٹ یا وراثت کی بنیاد پر نہیں۔ وہاں بڑے عہدوں پر آنے والے افراد نچلی سطح سے خدمت اور فلاح کے کام کر کے اپنی کارکردگی کی بنیاد پر اوپر لائے جاتے ہیں، اگر کسی پر معمولی الزام بھی عائد ہوتا ہے تو وہ استعفیٰ دے دیتا ہے، ہمارے یہاں ایسا نہیں۔

ہمارے ہاں اس نظام میں یقیناً بڑی خرابیاں ہیں اور ہم سب یہاں ان کی نشاندہی کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ ملک میں بیداری اور شعور کی ایک لہر جو پیدا ہوئی ہے وہ بہتری اور ارتقاء کے عمل کا ایک حصہ ہے۔ جمہوریت دو قسم کی ہے ایک بالواسطہ اور دوسرے بلا واسطہ، یہاں بالواسطہ جمہوریت ہے بلکہ پوری دنیا میں یہی طرز رائج ہے۔ بلا واسطہ جمہوریت کا تصور یونان میں تھا جہاں کمیونٹی کے افراد کہیں مل بیٹھ کر مقامی سطح کے فیصلے کرتے تھے۔ آج کل عوام کے نمائندے اسمبلیوں میں جاتے ہیں جہاں قانون سازی ہوتی ہے اور عدلیہ اور انتظامیہ کے ذریعے ان کا نفاذ ہوتا ہے۔ جمہوریت کی ابراہم لنکن نے جو تعریف کی ہے وہ عوام کی حکومت، عوام

کے ذریعے، عوام کے لئے، یہی صحیح تعریف ہے۔ علامہ اقبالؒ جن مغربی تصورات سے متاثر ہوئے ان میں جمہوریت سرفہرست ہے جیسا کہ اس میں عوام کی شراکت اقتدار اور جوابدہی کا تصور ان کے نزدیک اسلام کے طرز حکمرانی کے قریب ترین ہے۔ اس کے متبادل آمریت ہے جس میں خونریزی، جبر اور قتل و غارت گری ہے۔ جمہوریت کے فوائد پر غور کریں تو اس کا سب سے پہلا وصف پرامن انتقال اقتدار ہے اگرچہ کہ ابھی کافی حد تک اس میں مداخلت رہتی ہے لیکن ارتقاء و بہتری لائی جائے تو مداخلت کم ہوسکتی ہے جس کے بہتر ثمرات برآمد ہوں گے۔ ابھی بنگلہ دیش میں الیکشن ہوئے ہیں جہاں پورے ملک میں 15 یا 16 افراد قتل ہونے کی اطلاعات ہیں جبکہ پرتشدد انتقال اقتدار یا جابرانہ تسلط کی صورت میں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کے قتل ہونے کے بعد انتقال اقتدار ہوتا تھا۔

دوسرا وصف فلاح عامہ ہے۔ ہمارے یہاں ایوب خان کے زمانے میں بلدیاتی یا بنیادی جمہوریت کا جو نظام دیا گیا تھا وہ صحیح طور پر رائج نہیں ہوسکا۔ جس کی وجہ سے مقامی سطح پر ترقیاتی اور فلاحی کام صوبائی اور قومی اسمبلی کے ممبران کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ممبران صرف ووٹ لیتے وقت تو نظر آتے ہیں، اس کے بعد فنڈز کا زیادہ حصہ ان کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ اگر اختیارات نچلی سطح پر منتقل کر دیئے جائیں تو جمہوری نظام کا حسن مزید نکھر سکتا ہے۔ اگر عوام کی جوابدہی کے ساتھ ساتھ اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا ہو جائے تو یہ نظام مزید بہتری کی طرف گامزن ہوسکتا ہے۔ یعنی کہ کوئی ایک مسلمان حضرت عمرؓ کی طرح حکمران وقت سے پوچھنے والا ضرور ہونا چاہئے کہ جو یہ سوال کرے کہ آپ نے کپڑوں کے لئے اضافی کپڑا کہاں سے حاصل کیا۔ ہمارے ملک میں فلاح عامہ کے لئے بہت زیادہ رقم خرچ کی جاتی ہے۔ عوام بھی فلاحی کاموں اور اداروں کے لئے بڑی رقم خیرات کرتے ہیں، یہ بہت اچھی بات ہے لیکن یہ اعتماد نجی فلاحی اداروں کے لئے ہے حکومتی اداروں کے لئے نہیں ہے۔

عوام کی حکومت کا تصور ایسا ہے کہ اگر ہر آدمی کو یہ احساس ہو جائے تو سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے اور عوام حکومت کے اقدامات پر نظر رکھیں گے۔ اگر حکومت درست سمت میں نہیں جارہی تو اس شعور کے نتیجے میں اس کی برطرفی کی تحریک چل سکتی ہے اور وسط مدتی انتخابات کے نتیجے میں حکومت بدل دی جاتی ہے۔ جمہوریت

میں اخلاقی بہبود کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ بداخلاقی صرف سیاسی افراد میں نہیں ہمارے مذہبی طبقات بھی اس سے مبرا نہیں، لیکن جمہوریت اخلاقی بہبود کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے، جیسا کہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا رویہ۔ دوسرا یہ کہ آپ کا نمائندہ کھلم کھلا برائیوں اور بداخلاقی کا ارتکاب نہیں کرسکتا کیوں کہ اسے جوابدہی کا خوف رہتا ہے۔ اسی طرح اچھے کاموں کی تعریف بھی اخلاقی پہلو میں بہتری شمار کی جائے گی۔ درست راہ پر نہ چلنے والوں کا احتساب بھی ہو، جیسا کہ پہلے انہیں جوتے بھی پڑے ہیں۔

اسی طرح جمہوریت میں امن پسندی بھی ہے، سچ بات کو تسلیم کرنا۔ قرآن پاک نے لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلانے کا جو طریقہ بتایا ہے اس میں دانائی، حکمت اور مواعظ حسنہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر نصیحت کو موعظہ نہیں کہتے اس کے لئے حسن نیت اور اخلاص بھی ضروری ہے، حسنہ کا اضافہ، دائمی خوبصورتی اور اثر کا اظہار ہے۔ جمہوری طرز میں عوام سے رابطہ اور گفتگو ان امور کا تقاضا کرتی ہے، ہر وہ عمل جس میں حسن آجائے وہ نیکی ہے حسن سلوک بھی اس میں شامل ہے، یعنی برداشت، گالم گلوچ سے پرہیز اور حسن کردار نیکی بھی ہے اور جمہوری حسن بھی۔

میں نے خطبات جمعہ میں کافی عرصہ یہ موضوع رکھا اور غزوات اور سرایا میں آپ ﷺ نے حسن اخلاق اور اعلیٰ تہذیبی رویے کا جو معیار قائم کیا ہے اس کی تفصیلات بیان کیں۔ اس کی نظیر آج کل کہیں نظر نہیں آتی۔ امن پسند ہونا اسلام کا مستحسن ترین عمل ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی رائے کا احترام کریں اگر چہ یہاں جمہوریت میں ایسی مثال نہیں ملتی لیکن آہستہ آہستہ بہتری آتی جائیگی۔ شکوہ کرنا ناکافی ہے۔ ہمارا مزاج یہ بن چکا ہے کہ ہم شکوہ تو کرتے ہیں لیکن بہتری کے لئے اپنا کردار نہیں ادا کرتے۔ اہل اسلام کو زیادہ امن پسند ہونا چاہئے۔ منبر و محراب اور میڈیا سب کا کردار اہم ہے۔ ہمارا میڈیا بھی اپنے مخصوص مقاصد پر کام کرتا ہے اور زیادہ تر گروہ بندی کا شکار ہے۔ ہم محراب و منبر والے لوگ اگر اس ملک کی بہتری اور رضائے الٰہی کے لئے کام کریں تو خود بخود تبدیلی آئے گی۔ فرقہ واریت ایک بڑا فتنہ ہے ہر شخص نے اپنے اندر بت پال رکھے ہیں، فرقوں کے اندر بے شمار فرقے ہیں، جتنی شخصیات ہیں اتنے ہی فرقے ہیں۔ کسی بھی سوسائٹی میں تین چیزیں ہوتی ہیں، افکار، افراد اور اشیاء۔ اگر افکار اہم ہوں اور اس کے لئے افراد اور اشیاء قربان کی جائیں

تو وہ سب سے بہترین معاشرہ ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی اور سیرت بہترین نمونہ ہے۔ اگر افراد اور اشیاء اہم ہو جائیں تو زوال ہی زوال ہے۔ پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے یہ دنیا کی دوسری مملکت ہے جو نظریے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ یہ کلمہ طیبہ کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور اسی بناء پر قائم رہے گا۔

حب الوطنی ایمان کا حصہ ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے دائرے میں حب الوطنی کیسے لاسکتا ہے، کیسے اس کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرے، قانون کی پابندی کرے، اہل لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ نا اھل بھی عہدے سے دستبردار ہو جائیں۔ اپنی اپنی صلاحیتوں کو ملک کی بہتری کے لئے کام میں لائیں۔ ہمیں اپنی اپنی فیلڈ متعین کر کے ایک طرف یکسوئی سے کام کرنا چاہئے۔ اگر کوئی شخص تدریس اچھی کرسکتا ہے تو وہ طے کرلے کہ وہ سال میں اتنے بچوں کو پڑھائے گا اور رہنمائی کرے گا۔ اسی طرح اپنی اپنی صلاحیتوں کا الگ الگ سمتوں میں اظہار کیا جانا چاہئے۔

جمہوریت میں ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ عوام کے نمائندوں کو عوام میں جانا پڑتا ہے، عوام سے رابطہ رکھنا پڑتا ہے، ان سے ووٹ لینے کے لئے ان کی باتیں بھی سننا پڑتی ہیں۔ اگر نظام تعلیم اور محراب ومنبر کا نظام درست ہو جائے تو بہت کچھ درست ہوسکتا ہے اور معاشرے اور نظام میں کافی بہتری لائی جاسکتی ہے۔ اگر اسمبلیوں میں بھی اسلام پسند بیٹھے ہوں گے تو قومی سطح پر بھی نظام تعلیم میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اس لئے منبر ومحراب کی سطح پر ذہن سازی اور سیاسی عمل میں شراکت کے لئے شعور کی بیداری کی کوششیں کی جانی چاہیں۔ آج کے دور میں صدر طیب اردگان کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے ترکی کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمارے اسلام پسندوں کو یہ مثال ضرور سامنے رکھنا ہوگی۔

جمہوریت میں مساوات کا پہلو اہم ہے۔ انقلاب اور تشدد سے گریز ہے، انقلاب تباہی کا دوسرا نام ہے۔ جمہوریت سے سیاسی شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔ آج کے دور میں جمہوریت کا متبادل آمریت ہے۔ خلافت اور شورائیت اس سے ارفع تر نظام ہے جس میں جمہوریت کے اعلیٰ خواص بھی موجود ہیں لیکن ہم چونکہ ابھی جمہوری سسٹم کی بات کر رہے ہیں اور جمہوریت کے ساتھ چل رہے ہیں اس لئے ہم آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کی بات کر رہے ہیں جس میں اسلام کے اصولوں کے مطابق مزید بہتری لائی جاسکتی ہے۔ ہم

خلافت یا شورائیت کی مخالفت نہیں کر رہے جو ایک اعلیٰ اور مثالی نظام ہے لیکن اس کے قیام تک ہم موجودہ جمہوری نظام ہی کو ساتھ لیکر چلیں گے۔ آمریت کے مقابلہ میں جمہوریت اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اسلام کے زیادہ قریب ہے۔ خلفائے راشدین کا انتخاب اس کی بہترین مثال ہے۔

جمہوریت کے اجزائے ترکیبی میں علاقہ، حکومت، آبادی، اقتدار اعلیٰ ریاست کا حصہ ہوتے ہیں۔ دوسری تقسیم الحکم ہے کہ اس میں مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ ہے۔ مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے الگ الگ حصے ہیں۔ مذہبی مساوات بھی جمہوریت کا حصہ ہے سیرت پاک ﷺ سے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی اعلیٰ روایات ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جمہوریت میں سیاسی مساوات بھی ہے۔ ووٹ ملنا نہ ملنا الگ بات ہے لیکن ہر آدمی الیکشن کے لئے کھڑا ہوسکتا ہے اور اظہار رائے بھی کرسکتا ہے۔ انتخابات اگرچہ مکمل طور پر آزادانہ نہیں لیکن پہلے کی نسبت بہتری آتی جارہی ہے۔ پہلے تو مداخلت پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی تھی، اب کھلم کھلا تنقید بھی کی جانے لگی ہے۔ بہرحال تنقید برداشت کی جاتی ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم آئیڈیل ازم سے باہر نہیں آسکے۔ ہمیں آہستہ آہستہ تبدیلی کی طرف جانا ہے۔ آج دنیا کا اصول یہ بن چکا ہے کہ 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' اس اصول کو ہمیں عالمی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم خود یا اپنے نمائندے پارلیمنٹ میں بھیجیں گے تو سیکولر حضرات آگے آکر اپنی مرضی کا نظام اور قوانین نہیں لاسکیں گے۔

پاکستان کا نظام پارلیمانی جمہوری نظام ہے دوسرا صدارتی طرز کا جمہوری نظام ہوتا ہے جو امریکہ میں رائج ہے۔ میرے نزدیک پارلیمانی نظام بہتر ہے۔ اصل میں میرا نکتہ نظر یہ ہے کہ ایک نظام جو چل رہا ہے، اس کے اندر رہ کر کیسے بہتری لائی جاسکتی ہے اور اگر ہم اس سے کوئی بہتر سسٹم تشکیل دے سکتے ہیں تو اس کے لئے غور وفکر اور عمل کا میدان بڑا وسیع ہے، جیسا کہ ہم آئیڈیل ازم خلافت وشورائیت کی بات کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے ارادے اور آپ کی تربیت اسلامی اصولوں کے مطابق ایک ایسا بہتر سسٹم بنا کر دکھا دیں جس کے نفاذ کے لئے ہم سب مدد ومعاون ثابت ہوں۔

اسلام اور جمہوریت: کیا مطابقت ممکن ہے؟

سید احمد یوسف بنوری

مدرس جامعہ بنوری ٹائون کراچی

مقطع آ پڑی ہے، سخن گسترانہ بات

مجھے اسلام اور جمہوریت پر بات کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسلام اور جمہوریت یا اسلام اور سیاست پر جتنا گذشتہ صدی میں کام ہوا ہے اتنا شاید کسی اور موضوع پر نہیں ہوا۔ امین احسن اصلاحی صاحب نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ گذشتہ صدی میں بہت سارے اسلامی مکتب فکر وجود میں آئے جن کی بنیاد میں سیاسی مسائل زیادہ تھے اور ایسا پہلی صدی ہجری کے بعد اب گذشتہ صدی میں ہوا ہے۔ بیسویں صدی اس ضمن میں بہت مضبوط مواد فراہم کرتی ہے۔ خلافتوں کے تسلسل کے بعد بیسویں صدی پہلی صدی ہے جس میں مسلمان خلافت کے مرکز اور ٹائٹل سے محروم ہوئے۔ اس سے دو تین صدی پہلے مغربی جمہوریت پوری طاقت سے یورپ میں نافذ ہوئی پہلے اس نے عملاً یورپ کو اور پھر بعد میں پوری دنیا کو فتح کیا اور وہ اتنی مضبوط ہوئی کہ ان کے لٹریچر میں اس کے خلاف بات کرنا ایسا ہے جیسا کفر کرنا۔ اب وہاں انسانی ضمیر یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس کے برعکس بھی کوئی نظام ہوسکتا ہے۔ آپ جنگ عظیم پر غور کریں تو چرچل اور اس کے حواریوں نے یہ جنگ جمہوریت کے حق میں لڑی کہ ہٹلر جمہوریت کے خلاف ہے۔ مسلمانوں میں اس پر بہت بحث ہوئی۔ ایک صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ بحث جاری ہے کہ جمہوریت کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟ اس کے لئے سب سے پہلے ہم لفظ جمہوریت کی تعریف یا ڈیموکریسی کی تعریف پر غور کرتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں پرانے مغربی مفکرین کی آراء کو بھی دیکھنا ہوگا۔

جمہوریت کا نظام ان کی 4 سو سالہ فکر اور محنت کا تسلسل ہے اور ہم اس بات کے معترف ہیں کہ یہ

ایک جاندار نظام ہے۔ سب سے پہلی جمہوریت ایتھنز سے شروع ہوئی لیکن گذشتہ چار سو سال سے اس پر مغرب میں بہت زیادہ بحث ہو چکی ہے۔ اگر میں اس کے مقابلہ میں اسلامی اصطلاحات کا بیان شروع کر دوں تو یہ بحث لاحاصل ہے، لہذا ہم ڈیموکریسی کے حوالے سے گوگل پر سرچ کر کے جو تعریف دیکھتے ہیں ہم اسی کو لیکر آگے بڑھتے ہیں۔ ڈیموکریسی کی سادہ ترین تعریف یہ ہے کہ عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے حکومت چلائیں۔ چونکہ اس کا آغاز پچیس سو سال پہلے ایتھنز یونان سے ہوا جو تمام مغربی علوم کا منبع رہا ہے وہاں افلاطون نے ایک کتاب لکھی ہے [ریپبلک] جس کا ترجمہ جمہوریہ کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ اس کے اندر یہ اصول دیا گیا کہ جو بھی ملکی آبادی ہے وہ مل کر اپنی رائے سے ایک حکومت تشکیل دیں اور ایسے چلائیں۔ اس کے لئے ملک کے آزاد شہری کی رائے کے حاصل کرنے کی تخصیص تھی، جس کی وجہ سے ملک کے تمام شہری حکومت میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ صرف آزاد شہری حکومت چلانے کے لئے اپنے نمائندے منتخب کریں گے۔ گویا جن لوگوں پر آپ حکومت کر رہے ہیں وہ حکومت ان کی مرضی سے تشکیل پائے گی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام جمہوریت کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ قرآن میں زندگی کے عمومی اصولوں کا تعین نہیں کیا گیا جیسا کہ کھانا پینا زندگی کا عام اصول ہے تو قرآن نے کہا کہ ''کلوا وشربوا ولا تسرفوا'' کہ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔ یعنی جو نظام زندگی چلا آ رہا ہے اس کے سنوارنے کی بات کی ہے۔ اسی طرح اگر نظام حکومت کو دیکھا جائے تو قرآن نے اس کے لئے کوئی نمونہ نہیں دیا بلکہ اصحاب رسول ﷺ کی صفات بیان کی ہیں اور جمہوریت کے ضمن میں دیکھا جائے تو ایک آیت اس ضمن میں بیان کی جاتی ہے۔ وہ سورۃ الشوریٰ کی آیت ہے۔ وامرھم شوریٰ بینھم، یہ مکی آیت ہے ترجمہ ہے 'وہ اپنے معاملات میں باہم مشورہ کرتے ہیں'۔ اس آیت کو جمہوریت کے لئے ایک جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جبکہ یہ اصحاب رسول کی صفات میں سے ایک صفت بیان کی گئی ہے۔

اسی طرح ہم جناب رسول ﷺ کی ذات کو دیکھیں تو آپ ﷺ چونکہ وحی الٰہی کے پابند تھے۔ ان کی ہر بات حتمی طور پر دین کا حصہ ہے، آپ کسی سے مشاورت کے پابند نہیں تھے۔ آپ ﷺ کا ہر قول دین، بلکہ آپ ﷺ کی ذات ہی دین تھی۔ جو آپ کے ساتھ ہوگا وہ دین پر ہوگا جو آپ کے خلاف کھڑا ہوگا وہ

دین سے باہر ہوگا۔ آپ کا وجود حق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنی بلند سطح پر ہونے کے باوجود یہ آپ کی شان رفیع ہے کہ آپ تمام امور میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس بات سے ہم آج کی جمہوریت کا اثبات آپ ﷺ کی ذات سے نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ کے بعد اگر صحابہ کرامؓ باہم مشورہ کرتے ہیں اور ان میں اختلاف ہو جاتا ہے تو مجبوراً اکثریتی رائے کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔ لیکن ہم ان باتوں سے یہ اخذ نہیں کر سکتے کہ قرآن نے جمہوریت کو قانونی قرار دیا ہے۔ کچھ افراد کو معاشرے میں وہ حیثیت حاصل ہے جو دوسروں کو نہیں۔ لہذا اس آیت میں اصحاب رسول ﷺ کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ برابری کی سطح پر مشورہ کرتے ہیں تکبر نہیں کرتے۔ اسے اگر جمہوریت کہا جائے تو اس کے مدمقابل اسلام نہیں بلکہ صرف اور صرف آمریت ہے۔ میں اور کسی آیت کا حوالہ نہیں دوں گا۔ بات آگے بڑھاتے ہوئے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد اس پر عمل کی صورت کیسے سامنے آتی ہے۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا مسئلہ ہے اس کے بارے میں اہلسنت کا صحیح بیانیہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی طرف سے اس بارے میں اشارے ضرور دیئے گئے لیکن حتمی فیصلہ نہیں دیا گیا، اس لئے خلافت کے معاملہ پر پہلے اختلاف ہوا، پھر بعد میں متفقہ طور پر آپؓ کو خلیفہ مان لیا گیا، یہاں سے شیعہ وسنی اختلاف شروع ہوتا ہے۔ اہلسنت کے نزدیک اس سلسلے میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ترجیح دی ہے۔ خلافت تیس سال رہی پھر حکومت آئی۔ کیونکہ خلافت میں عوام کی رائے اور مشاورت شامل رہی۔ ملوکیت میں مشاورت نہ رہی تو گویا جمہوریت نہ رہی۔ تو جمہوریت کے اثبات میں تین چیزیں میں نے پیش کر دیں ایک قرآن کی آیت دوسرے خلافت ومشاورت اور تیسرا صحابہ کرامؓ کا عمومی مزاج۔

اب موجودہ مغربی جمہوریت میں اسلام کے برعکس جو خامیاں ہیں ان کو واضح کروں گا۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ کا ایک واضح تصور ہے اور اسلام کا مقام احسان یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی قادر مطلق اور عظیم الشان ذات کی ہمہ وقت اپنے ہمراہ موجودگی کا احساس کریں کہ خدا ہر وقت آپ کو دیکھ رہا ہے۔ یہی حاکمیت اعلیٰ کا تصور ہے۔ ہمارے یہاں تو 1973ء کے آئین میں اس کا واضح تعین کر دیا گیا ہے۔ لیکن سیکولر حکومتوں میں حاکمیت اعلیٰ کا اختیار پارلیمنٹ کو سونپ دیا گیا ہے جہاں وہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کے برعکس اپنی مرضی کے قوانین

بنا سکتے ہیں۔ البتہ بطور مسلمان ہم اپنی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ معاملاتِ زندگی میں اس کی رضا کو مقدم رکھا جائے گا۔ میرے لئے شراب پاکستان میں بھی حرام ہے اور انگلینڈ میں بھی، وہاں قانون میں جائز ہے لیکن میرے لئے مذہب میں حرام ہے۔ ریاست بعض اوقات درست فیصلے کرتی ہے بعض اوقات غلط، لہذا فرد کو ذاتی زندگی میں یہ آزادی ہے کہ وہ اپنے لئے کس چیز کو پسند کرتا ہے یہی جمہوریت ہے۔

جمہوریت کے بہت سارے مظاہر ہیں جیسے مقنّنہ ہے، عدلیہ ہے، اپوزیشن ہے، الیکشن کمیشن وغیرہ یہ سب اس کے مظاہر ہیں جو غلط ہو سکتے ہیں۔ جمہوریت اپنی روح کے اعتبار سے غلط نہیں ہے۔ واضح رہے کہ ہمیں جمہوریت کی روح اور اس کے مظاہر میں تفریق رکھنی چاہئے۔ امریکہ کے اند 200 سو سال سے جمہوریت ہے لیکن عورت کو ووٹ کا حق بہت دیر سے دیا گیا۔ بلوچستان میں رائے دہی کا حق 1970ء میں دیا گیا۔ ابھی بھی نظام میں ہزاروں مسائل اور خرابیاں ہیں مگر یہ وہ مظاہر ہیں جو ہمارے لئے تگ ودو کا میدان ہیں۔ جن میں مزید بہتری لائی جاسکتی ہے۔ ہم مظاہر میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ جمہوریت اپنے جوہر کے اعتبار سے اسلام میں موجود تھی اور مظاہر کے اعتبار سے ترقی یافتہ شکل میں تھی، اسی اصول پر خلفائے راشدین کے انتخاب کا مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلے میں نے جمہوریت کی تعریف بیان کی۔ دوسرے بتایا کہ اسلام میں جمہوریت کا جوہر کیسے موجود ہے۔ پھر موجودہ جمہوری نظام کے بارے میں بتایا کہ اس پر اعتراضات کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔ میرے نزدیک جمہوریت کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ صرف اسے اس کے اصل جوہر کے ساتھ نفاذ کی ضرورت ہے جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ جو لوگ اس کے خلاف ہیں انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے کہ انسان اپنی مرضی سے خدا کی مرضی اور اس کے نظام کے نفاذ کی کوشش کریں۔

علامہ عبدالحق ہاشمی

امیر جماعت اسلامی بلوچستان

ہمارے ملک کو آئین کے اندر اسلامی جمہوریہ پاکستان سے موسوم کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ جمہوریت

کے علمبردار اور مبلغین ہیں جبکہ کچھ اس کے مخالف بھی ہیں۔ ان میں بھی انتہائی سخت مؤقف رکھنے والے بھی ہیں۔ بنیادی طور پر ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جمہوریت ایک نئی اصطلاح ہے اور یہ مغرب سے ہمارے ہاں آئی ہے۔ اس کا ترجمہ ڈیموکریسی سے کیا گیا ہے۔ اس سے مراد لوگوں کی اکثریت کی حکومت ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ اہل علم نے جمہوریت کے عنوان سے کیا ہے۔ ہمارے بعض افراد نے چونکہ یہ سمجھا کہ چونکہ یہ اصطلاح مغرب سے آئی ہے لہذا ہمارے لئے قابل قبول یا قابل عمل نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی قدیم اسلامی فقہ کو دیکھیں تو لفظ جمہور بہت زیادہ استعمال میں آیا ہے جو کہ اکثریت کے معنوں میں لیا جاتا ہے اور مسائل میں جمہور کے مسلک کی پیروی کو راہ صواب خیال کیا جاتا ہے۔ گویا یہ اصطلاح ہماری ہی ایجاد کردہ ہے۔ ریاستی جمہوریت کی تعریف جیسا کہ مغرب نے کی ہے، 'عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کی مرضی سے'۔ مغرب کے ہاں اس اصطلاح کا تعلق کسی مذہب یا روحانیت سے نہیں اور نہ ہی کسی بلند پایہ شخصیت سے منسلک ہے بلکہ عوام کی حکومت کو جمہوریت قرار دیا گیا ہے جس سے عوام کے مسائل حل ہوں۔ اس تصورِ حکومت یعنی جمہوریت کی مغربی نہج اپنی جگہ درست تھی مگر ہم اپنے مذہبی پہلو کے اعتبار سے اسے اپنے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات اسے غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔

اعتقادات و روحانیت اور مذہبی تصورات کے حامل افراد جو الہامی تعلیمات کو زندگی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں وہ اپنے خیال میں جمہوریت کی مغربی اصطلاح سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں بھی بعض تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہمارا طرز زندگی ہے۔ بہت سارے ایسے نئے رویے اور طرز معاشرت کو ماحول کی وجہ سے اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں جو ہمارے اسلاف کے طرز زندگی، لباس یا رواج کے مطابق نہیں ہوتا۔ اس وقت ہم اسے بدعت یا خلاف شریعت خیال نہیں کرتے لیکن مغربی تعلیم و افکار کے ضمن میں جیسا کہ اصطلاح جمہوریت کی بات ہے اسے خلاف شریعت قرار دیتے ہیں۔ مثلاً پاسپورٹ، شناختی کارڈ، امتحانی نظام اور تصویر وغیرہ کے ضمن میں مغربی طرز کو اپنانے پر مجبور ہیں۔ ملکی اور شہری حد بندیاں اور قوانین جیسا کہ تمام ممالک کی سرحد کی حد بندی اور کسٹم و تجارت کے عالمی قوانین ہیں جن کی ہم پیروی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم کسی شرعی فتوے کا جواز نہیں مانگتے اور نہ ہی قرآن و سنت کی تشریح کے متلاشی ہوتے ہیں، لہذا

یہی رویہ جمہوریت کی اصطلاح کے بارے میں مدنظر رکھا جانا چاہئے۔ ہمارے عسکری نظام میں بھرتی سے لیکر ریٹائرمنٹ تک نہایت مخصوص قوانین ہیں کوئی ان سے ہٹ کر ترقی، پرموشن یا بھرتی کا تصور نہیں کرسکتا۔ اسی طرح زندگی کے تمام دیگر شعبہ جات کے اپنے اپنے طریقہ کار ہیں جنہیں خواہی نہ خواہی ہم سب نے قبول کر رکھا ہے۔ یہ فنون زندگی ہیں لہذا ہم مغربی جمہوریت کو بھی ایک فن حکومت کے طور پر دیکھیں تو یہ کوئی ایسا خلاف مذہب نظام نہیں۔ یہ بھی شعبہ زندگی کا ایک فن شمار ہوگا۔ یہ حکومت اور نظام کو چلانے کے لئے ایک ماڈل ہے جو کہ دنیا میں رائج ہو چکا ہے۔ ہم بالکل اسی طرح اس سے استفادہ کر سکتے ہیں جیسا کہ طب، سرجری اور زراعت کے لئے مغربی تعلیم وفن سے مدد لی جارہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے وقتوں میں مسلمان اپنے عروج کے دور میں ان علوم وفنون کے بانی تھے اور تمام شعبہ ہائے حیات میں ہر طرح کے نئے نئے نظاموں کی بنیاد رکھتے تھے، آج مغرب کا عروج وترقی ان کے فن وتعلیم کی پیروی کے لئے دنیا کو مجبور کر رہا ہے۔ یہ تاریخ کی تدوین ہے اور اصول زندگی ہیں۔ آج شومئی قسمت ہم مغرب کی پیروی اور تقلید کے لئے مجبور ہیں۔ آج ہم کوئی نئے اصول یا نظام دنیا کو دینے کے قابل نہیں ہیں لیکن اگر آپ کو اپنے مذہبی اعتقادات کے حوالے سے کسی مقام پر کوئی تحفظات ہیں تو آپ ان اعتقادات کے مطابق مغرب کے فن وفکر اور نظام کے اندر تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ آپ کو کسی نے من وعن تقلید کے لئے مجبور نہیں کیا۔ آپ اپنے ملکی حالات، افکار، مزاج اور عرف کے مطابق اس میں ترمیم یا تبدیلی عمل میں لا سکتے ہیں۔

کسی بھی شعبے کے اندر تبدیلی کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ جیسا کہ سول سروس کا شعبہ ہے جو انگریزوں کے دیئے گئے نظام کے مطابق چل رہے ہیں، کچھ جزوی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں لیکن استعداد و صلاحیت ہو تو زیادہ بہتری بھی لائی جاسکتی ہے۔ اب مدارس کی رجسٹریشن کا ایکٹ 1860ء کا چلا آرہا ہے جس کو ابھی تک نئے سرے سے مدون نہیں کیا گیا، اسی پر اکتفا کیا گیا ہے تو یہ ہماری افسر شاہی کی کوتاہی ہے۔ ہمیں کسی نے اس قانون کو برقرار رکھنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہمارے یہاں اس تھکن اور پژمردگی کا اثر ہے کہ ہم خاطر خواہ تبدیلی نہیں لا سکے۔ کسی اور کی طرف سے کوئی قدغن نہیں کہ آپ نے من وعن مغرب ہی کے قوانین پر چلنا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں سیرت طیبہ سے بھی یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد سابقہ

طریقوں، رسم ورواج اور سماجی قوانین کو یکسر منسوخ نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ ان میں تبدیلی لائی اور بہت ساری چیزوں کو برقرار بھی رکھا۔ جیسے دور کفر کا نکاح اسلام میں بھی برقرار رکھا گیا ہے، منسوخ نہیں ہوا۔ اس میں عبادات جیسے حج کے قدیم طریقے بھی شامل تھے آپ ﷺ جو تعلیمات لے کر تشریف لائے وہ بذات خود اس قدر لطیف اور جاذب نظر تھیں کہ لوگ خوشی خوشی ان کو اپنانے لگے۔

اسی طرح بعض قدیم رسموں کے خاتمے کے لئے تدریجاً ایسی اصلاحات پیش کیں جس سے معاشرے میں تبدیلی آتی چلی گئی اور قدیم اصول ورسوم معدوم ہوتے چلے گئے۔ یہاں پر ایک اہم مثال غلامی کی ہے جس پر ہمارے بعض لبرل حضرات تنقید بھی کرتے ہیں کہ اسلام کیسا مذہب ہے جس میں غلام اور لونڈی کا تصور دیا گیا ہے تو حضرات گرامی غلامی کا تصور اسلام نے نہیں دیا بلکہ اس سے قبل ارسطو وافلاطون جن کی لبرل حضرات پیروی کرتے ہیں ان کے دور میں بھی غلامی کا یہ تصور نہایت تلخ حقیقت کے طور پر موجود تھا۔ آپ ﷺ نے معاشرتی حالات اور غلاموں، لونڈیوں کی کسمپرسی کی وجہ سے اسے یکسر منسوخ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو لاکھوں افراد بے یارومددگار اور تباہ حال رہ جاتے جیسا کہ جنگوں کا دستور ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے الہامی حکمت کے تحت اسے برقرار رکھتے ہوئے غلاموں اور لونڈیوں کے ایسے حقوق کا تعین کر دیا کہ وہ گھر کا ایک فرد شمار ہونے لگے۔ یوں ایک قبیح رسم کو احسن صورت میں بدل دیا۔ غلاموں اور لونڈیوں کو اپنی اولاد کی طرح کھلانا پلانا اور آرام سے رکھنا واجب قرار دیا۔ ہمت سے زیادہ مشقت ممنوع قرار دی گئی۔ صاحب اولاد لونڈی کی بیع بھی ممنوع ہوئی۔ اسی طرح ان کو آزاد کرنے پر بے انتہا اجر وثواب کی بشارت دی گئی جس کے باعث غلامی کی رسم سابقہ صورت میں برقرار نہ رہی اور آج کے دور میں ختم ہو چکی ہے۔ آپ ﷺ نے نکاح کو ایک بہترین صورت عطا کی۔ مرد وعورت کے حقوق متعین کئے۔ امید اور اظہار کی سابقہ صورتوں کو برقرار رکھ کر ان کے لئے شرعی حدود متعین کی گئیں۔ اسی طرح مال غنیمت کو حلال کیا گیا جو سابقہ امتوں کے لئے حرام تھا، اس کی تقسیم کے لئے اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ اسی طرح غنیموں میں چوری کا جو سلسلہ رائج تھا وہ ختم ہو گیا یوں انسانی خواہشات کو بھی مدنظر رکھا گیا۔

یہ سب مثالیں تھیں، ان کی روشنی میں ہمیں جمہوریت کو ایک فن ریاست اور فن حکومت کے طور پر

دیکھنا چاہیے، یہ حکومتوں کو چلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ آج کے جدید معاشرے میں چونکہ یہ پوری دنیا میں رائج ہے اور عوام کے شراکت اقتدار کے لئے فی الحال اس کا کوئی متبادل نہیں ہے، لہذا اسے اپنانا ایک مجبوری ہے۔ خلافت ایک اصطلاح ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت اکثریتی رائے کے حصول تک مصدقہ نہیں قرار پائی یہاں تک کہ تمام لوگوں نے انہیں اپنا خلیفہ مان لیا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت ایک نامزدگی تھی، لیکن عوام بھی اس پر متفق ہو گئے، کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کی خلافتیں بھی شورائیت کا نتیجہ تھیں۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی امارت کے دوران یزید کی بیعت لینا شروع کی تو صحابہ کرامؓ کی اکثریت نے اس کی تائید نہیں کی۔ حضرت امام حسینؓ کا یزید کے خلاف نکلنا بھی اس کے طرز حکومت سے اختلاف تھا جو کہ نہ صرف موروثیت تھی بلکہ عوام کے لئے بھی قابل وقبول نہ تھی۔ یہ جمہوریت وخلافت کی اصطلاحات محض لفظی نزاع ہے۔ اگر غور کریں تو خلافت کا قیام بھی عوام کی اکثریت کی تائید کے مرہون منت ہے۔ جمہوریت میں بھی اکثریت ہی کی حمایت سے حکومت وجود میں آتی ہے۔ ہم اگر دنیا میں انقلابات کی مثال دیکھیں ،انقلاب فرانس، روس، چین وایران کو دیکھیں تو یہ سارے انقلابات جمہور کی تائید سے روبہ عمل ہوئے۔ عوام کی اکثریت کی تائید سے ہی تبدیلی ممکن ہوئی۔ آج اگر کوئی جماعت یا گروہ پرانے نظام کو منسوخ کر کے نیا نظام لے کر آنا چاہتا ہے تو اسے بھی عوام کی اکثریت کی تائید حاصل کرنا ہوگی۔ بہتر تو یہی ہے کہ اس کے لئے موجودہ نظام میں رہتے ہوئے کام کیا جائے۔

اصل بات یہ کہ اصل مسئلہ قیام نظام نہیں بلکہ استمرار نظام ہے جو قانون پر عملدرآمد کرنا ہے۔ انقلاب ایران کی مثال دیکھیں تو انہوں نے استمرار نظام پر زور دیا اور عوام کی اکثریت کی تائید سے جمہوری فن حکومت کے مطابق نظام ترتیب دیا۔ صدارتی نظام کے مطابق ووٹ کے ذریعے حکومت تشکیل دی جاتی ہے اور ووٹ کے ذریعے پارلیمنٹ تشکیل دی جاتی ہے۔ اب تو سعودی عرب میں بھی بلدیاتی شوریٰ اور قومی شوریٰ تشکیل دی گئی ہے تاکہ بادشاہت کے نظام میں شورائیت کے ذریعے عوام کی شراکت اقتدار ہو۔ ہم مغربی جمہوریت کو اپنے ملک کے مطابق ترمیم وتبدیل کر کے نظام حکومت تشکیل دینے کے لئے ایک فن کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے لئے اصلاح کا دروازہ کھلا ہے، تبدیلی کے لئے کہیں کوئی قدغن نہیں، مثال کے

طور پر مغربی جمہوریت اگر ہم جنس پرستی کی اجازت دیتی ہے تو ہماری پارلیمنٹ میں ایسا کوئی قانون نہیں بن سکتا جو قرآن وسنت کے منافی ہو۔اس حوالے سے جو بھی غلط مبحث پیدا ہو گیا ہے،اس سے چھٹکارے کے لئے علماء ہی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں تا کہ جمہوریت کے حوالہ سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہو۔

علامہ عمار خان ناصر

وائس پرنسپل الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ

زیر بحث موضوع کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کے لئے ماضی میں جا کر ایک فریم ورک آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا۔اس طرح کی بحثوں پر گفتگو اور مکالمہ میں ماضی کی جو روایت رہی ہے اس میں اہل علم کی دلچسپی کس نوعیت کی رہی ہے اور کیا ہماری دلچسپی کی نوعیت،سنجیدگی اور رویہ ان جیسا ہے یا ان سے مختلف ہے۔اگر مختلف ہے تو اس کے اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔اسلام اور جمہوریت،قومی قانون اور جمہوریت وغیرہ بنیادی طور پر نظم سیاسی سے متعلق سوالات ہیں یعنی سیاست ،حکومت ،اقتدار اور معاشروں کی تنظیم کن اصولوں پر ہو اور اسلامی شریعت نے جو اصول مقرر کئے ہیں ان کے ساتھ ان کی کیا مطابقت ہے۔

سب سے پہلی بڑی سیاسی بحث جو اسلامی تاریخ میں اس حوالے سے تھی وہ یہ کہ اقتدار پر فائز ہونا کس کا حق ہے۔خاص طور پر اگر کوئی اسلامی اصولوں کے مطابق اقتدار کی اہلیت نہ رکھنے کے باوجود اقتدار پر فائز ہے تو اس کے بارے میں ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہئے۔خوارج نے جو نکتہ اختیار کیا اس کی بھی دینی،فکری اور اعتقادی بنیادیں تھیں۔ان کا مقدمہ یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ نے سابقہ دونوں خلفاء کی روایات سے انحراف کیا،جبکہ اہلسنت کا مؤقف یہ رہا ہے کہ دونوں خلفاء اپنے اپنے اقدامات میں حق پر تھے۔لیکن علماء اہلسنت نے خوارج کے مؤقف واستدلال کی بطور اصول مخالفت نہیں کی بلکہ صرف دو مؤخر الذکر خلفاء کے اقدامات کی جوازیت کو ثابت کیا ہے۔خوارج کا کہنا تھا کہ بنو امیہ کی حکمرانی جائز نہیں،یہ خلاف شریعت فیصلے کرتے ہیں اور شریعت سے انحراف کرتے ہیں،یہ ظالم وجابر ہیں،ان سے بغاوت کرنا ایک دینی فریضہ ہے۔

اس ضمن میں ان کا عملی رویہ انتہائی شدت پر مبنی تھا۔ وہ نہ صرف حکمرانوں کی تکفیر کرتے تھے بلکہ ان کی اطاعت کرنے والے عامۃ الناس مسلمانوں کی بھی تکفیر کرتے تھے اور ان کے ساتھ جہاد وقتال کا حکم دیتے تھے۔

اس سیاسی بحث کے حوالے سے علماء کے طبقہ نے اپنا جو کردار ادا کیا، جو غور وفکر کیا اور اس کے بعد اپنی آراء اور فتاویٰ پیش کئے مگر انہیں اس کام کے لئے حکومت وقت یا دیگر کسی طبقہ کی طرف سے آمادہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومتوں کا حصہ نہیں تھے۔ ان کا یہ کردار دین وعلم کے ایک مرکز اور رہنمائی کے طور پر تھا۔ عوام وحکمران دونوں رہنمائی کے لئے ان کی طرف دیکھتے تھے۔ طبقہ علماء نے اس ضمن میں جو کردار ادا کیا اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کو ایک ذاتی علمی مسئلہ کے طور پر دیکھا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق اپنا کردار ادا کیا۔ حکمرانوں نے کبھی ان سے اس معاملہ میں فتویٰ طلب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علماء نے خوارج کے مؤقف کے جواب میں ایک مکمل علم الکلام مرتب کیا اور پوری ملت کے لئے ایک جامع مؤقف مرتب کرنے کی سعی کی، استدلال واضح کئے اور خوارج کے مؤقف میں جو غلطی تھی اس کو بھی واضح کر دیا۔ علمائے کرام نے اس وقت کے بنوامیہ کے حکمرانوں کی غلطیوں کا دفاع بھی نہیں کیا اور نہ ہی ان کے غلط اقدامات کو جائز قرار دیا۔ انہوں نے دونوں باتیں تسلیم کی ہیں کہ حکمرانوں کی پالیساں اور ان کا انتخاب بھی غلط ہیں۔

خلفائے راشدین کے بعد بہت دیر تک ہمیں مسلمان حکمرانوں کے ہاں اچھے یا مثالی اقتدار کا نمونہ نظر نہیں آتا، سوائے عمر بن عبدالعزیز یا دیر بعد کے چند حکمرانوں کے۔ خلفائے راشدین کے طرز حکومت سے مختلف اصولوں پر ہمارے ہاں خلافت وسلطنت کا سلسلہ بڑی دیر تک قائم رہا اور اس پورے دور میں اس انحراف کو مانتے ہوئے فقہائے کرام، علماء اور آئمہ دینی ذمہ داری اور کردار بطور احسن ادا کرتے رہے۔ وہ اس دوران اسلامی سلطنت اور تہذیب کی ترقی اور ملت اسلامیہ کی دینی وعلمی تربیت کے لئے صدیوں تک اپنا کردار واضح طور پر ادا کرتے رہے۔ سارے دینی علوم وفنون اسی دور میں مرتب ہوئے۔ اصول تفسیر، اصول تدوین حدیث، اصول تدوین فقہ سارے اسی دور میں مرتب ہوئے۔ حدیث وفقہ کو بڑے پیمانے پر مدون کیا گیا، حتیٰ کہ ریاستی قانون جس کی بنیادی ضرورت حکمرانوں کو تھی اس کے لئے بھی حکمرانوں کو الگ سے کوئی انتظام نہیں

کرنا پڑا کہ وہ اپنی ریاستی وقانونی ضروریات کے لئے الگ سے کوئی ادارہ بنائیں۔اسلامی اور ریاستی قانون کی تدوین، ان پر غور وفکر، قانونی مسائل کا حل، ان تمام کے لئے علماء اور وفقہائے کرام نے ذاتی طور پر اپنا کردار ادا کیا۔ان کی اس مساعی سے نہ صرف ریاست اور حکمران بلکہ معاشرہ اور عوام الناس یکساں طور پر مستفید ہوتے رہے۔ایک عرصہ کہ بعد ان میں سے ایک طبقہ مناصبِ انصاف یعنی قاضی اور قاضی القضاۃ کے طور پر ریاستی امور میں عملاً بھی شریک ہوتا رہا۔اقتدار سے متعلق سیاسی نظریے یعنی پولیٹیکل تھیوریز کہ اقتدار کیا ہوتا ہے، حکمرانوں کی اہلیت اور خواص کیا ہونے چاہئیں، ان کے فرائض و ذمہ داریاں کیا ہیں، یہ ساری رہنمائی علماء وفقہا کے طبقات نے کی ہے۔

خلفائے راشدین کے بعد خاندان قریش یعنی بنوامیہ اور بنوعباس کا دور تقریباً 5 صدیوں تک محیط ہے، اسے اسلامی سلطنت وسیاست کا دور اولین کہا جاسکتا ہے۔لیکن علماء وفقہا نے اپنی ذمہ داریاں کسی حکومتی یا مالی مفاد، حکومت میں شمولیت اور حکمرانوں کی رہنمائی کی خواہش واستدعا کے بغیر محض خلوص وللّٰہیت اور بطور رہنما دینی فرض سمجھتے ہوئے ادا کیں۔منصب قضاء پر فائز ہونے والے علماء چند ہی تھے مگر ان کا منصب فتویٰ و رہنمائی نہیں بلکہ قضاء وانصاف کا تھا۔یہی صورت حال بعد میں آنے والے ادوار یعنی وسط ایشیاء کی حکومتوں، منگول نسل کے حکمرانوں، برصغیر کی سلطنت اور خلافت عثمانیہ میں بھی قائم رہی۔بڑے انہدام اور زوال کے بعد نئی حکومتوں، سلطنتوں اور خاندانوں کا ظہور ہورہا تھا اور نئے مباحث جنم لے رہے تھے، جیسا کہ ایک یہ سوال بھی اٹھا کہ خلافت کیا صرف قریش کے لئے ہے یا غیر قریش بھی اسلامی خلافت کے منصب پر آسکتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ حدیث پاک ﷺ کے مطابق خلافت قریش کے لئے ہے، خلافت عباسیہ تک یہی مؤقف قائم رہا۔خوارج کا ایک انحراف یہ بھی تھا کہ خلافت صرف قریش کے لئے نہیں ہے، اہل ہونا ضروری ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔قریش کے بعد منگول نسل کی اقوام آئیں اور پھر یہ بحث پیدا ہوئی کہ خلافت اب دوسری اقوام کے پاس جارہی ہے تو ان کے بارے میں کیا مؤقف اختیار کیا جائے۔اس سوال کے جواب میں بھی وقت کے علماء وفقہا نے پوری ذمہ داری کے ساتھ رہنمائی کرتے ہوئے نئے سیاسی نظریات پیش کئے، فقہی طور پر اجتہاد کیا اور ایسا مؤقف پیش کیا کہ پورا اسلامی معاشرہ ایک نئی نہج پر استوار ہوگیا۔

علماء نے تاتاریوں اور منگولوں کی حکومت کے حوالے سے جو نرم مؤقف اختیار کیا اس کے نتیجے میں نہ صرف وہ لوگ مسلمان ہوئے بلکہ ان کی آنے والی نسلوں نے اسلام کی تہذیبی علمی قوت کے سامنے سرنگوں ہو کر زیادہ وسعت اور بہتری کے ساتھ خاندان قریش سے بھی زیادہ عرصہ اسلام کے پرچم کو سربلند رکھا۔ ان میں تیموری، عثمانی اور برصغیر کے مغل حکمران نمایاں ہیں۔

مرکزی برصغیر میں ایک باقاعدہ مسلمان سلطنت کا قیام خاندان غلاماں سے ہوا تھا، بعد میں مغلوں نے زیادہ ترقی یافتہ اور مضبوط حکومت قائم کی۔ جب مغلوں کا اقتدار ختم ہوا اور مسلمان زوال کا شکار ہوئے تو انگریزوں نے برصغیر پر قبضہ کرلیا۔ اس نئی صورت حال میں مسلمان چونکہ سیاسی طور پر کمزور ہو گئے تھے اس لئے بہت سے نئے سیاسی وفکری مسائل نے جنم لیا۔ اس صورت حال میں بھی علمائے کرام نے اپنی اجتہادی بصیرت کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی کردار کے حوالے سے وقتاً فوقتاً جو رہنمائی کی وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ مثلاً ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام، اس بارے میں اختلاف رائے ہوا تو شاہ عبدالعزیزؒ نے دارالسلام ہونے کا فتویٰ دیا۔ 1857ء کی جنگ میں بھی یہ مسئلہ اٹھا۔ اس بڑے سوال کو علماء نے اپنی دینی ذمہ داری کے طور پر نبھایا۔

انگریزوں نے اقتدار میں آکر طرز زندگی میں جو بڑی تبدیلیاں لائیں جیسے تعلیمی نظام اور قانون سازی کا نظام ہے، ان میں پہلے فیصلے فقہ حنفی کے مطابق ہوتے تھے اب اینگلوسیکسن یا برطانوی قانون رائج کیا گیا جبکہ اس میں مسلمانوں کے بھی چند قوانین شامل کئے گئے جنہیں اینگلومحمڈن لاء کا نام دیا گیا۔ نظام تعلیم و قانون سازی کے عمل میں جو بڑی تبدیلیاں کی گئیں اس حوالے سے بھی علمائے کرام نے اپنے اپنے مؤقف کا اظہار کیا اور دینی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ تحریک آزادی کے ساتھ ایک اور بڑا اہم سوال سامنے آیا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد یہاں نظم سیاست وحکومت کی صورت کیا ہوگی۔ کیا مسلمانوں کو اپنی اصل سلطنت کی بحالی کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے یا انگریزوں نے جو نئے سیاسی تصورات پیش کیے ان کے مطابق کوئی صورت اختیار کرنی چاہئے جس میں رائے دہی، ووٹ، انتخاب اور جمہوریت کے قوانین وغیرہ شامل ہیں۔ کیا ہمیں انہی کے مطابق کوئی نئی راہ متعین کرنی چاہئے۔ یہ ایک بڑا سوال تھا، اس میں بڑے مباحث ہوئے،

علماء نے ان تمام موضوعات پر اپنے مؤقف اور رائے کو واضح کیا۔ اس سارے عمل میں علماء کے باہم اختلاف بھی رہے لیکن جو چیز میں نمایاں کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا سوال حکومت، سیاست و معاشرت کی تشکیل سے متعلق سامنے آیا علمائے کرام نے دینی فریضہ سمجھتے ہوئے اس کے بارے میں رہنمائی فراہم کی۔ اس کے بعد جب برصغیر تقسیم ہوا اور پاکستان بن گیا تو ریاست کے سامنے بڑے سوالات پیدا ہوئے کہ نئی ریاست کے اقتدار نوعیت اور شکل کیا ہوگی، حکومت کے اصول کیا ہونگے۔ ہمارے علماء نے اس ضمن میں نہایت ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اپنا کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے بھی علماء کرام نئی ریاست کے نظام اور اسے اپنے قیام کے مقاصد کے مطابق خطوط پر استوار کرنے کے لئے علمی وفکری طور پر کام کا آغاز کر چکے تھے۔ اس کی تحریک مسلم لیگ کے نواب اسماعیل نے علماء کے ایک طبقے کے سامنے رکھی تھی۔

مولانا اسحاق سندیلوی اور سید سلمان ندوی نے نئی اسلامی حکومت کے خدوخال کے حوالے سے ایک کتابچہ تحریر کیا۔ پاکستان بننے کے بعد تمام مکاتب فکر کے 31 جید علماء نے اکھٹے ہو کر اس بات کو طے کیا کہ مذہبی و شرعی نکتہ نظر سے نئی ریاست کے اصول اور نظام کیسا ہونا چاہئے۔ 1951ء میں ان علماء نے طویل نشستوں کے بعد 22 دستوری نکات کے عنوان سے سفارشات پیش کیں۔ آئین پاکستان 1956ء کی تشکیل سے پہلے علماء کرام کی طرف سے اس ضمن میں رہنمائی کے لئے یہ ایک اہم ترین پیش رفت تھی، اس کے لئے انہیں کسی حکومت نے کوئی درخواست نہیں کی اور نہ ہی رہنمائی کے لئے مجبور کیا، بلکہ ان تمام علماء نے داخلی احساس ذمہ داری کے ساتھ یہ فریضہ انجام دیا۔ اس سارے پس منظر کو سامنے رکھ کر اگر پچھلی دو باتوں پر غور کرتے ہیں جن کے تناظر میں یہ سارے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جمہوریت کیا ہے، کفر ہے یا اسلام، سازش ہے یا نہیں۔ دنیا میں کئی واقعات ہوئے اور پرتشدد تحریکیں ابھریں جنہوں نے بزور طاقت ایسی اسلامی ریاست کے قیام کو اپنا مقصد قرار دیا جس کا تاریخ میں کوئی وجود نہیں۔ گذشتہ دو سو سال کے دوران علماء نے اجتہاد کے ذریعے جمہوریت اور اسلام میں جو مطابقت پیدا کرنے کوشش کی تھی کہ ان ان شرائط کے تحت ایک اسلامی مملکت میں جمہوری نظام کی تشکیل ممکن ہوسکتی ہے۔ اس پورے بیانیہ کو ان متشدد گروہوں نے رد کر دیا کہ جمہوریت کفر ہے، پاکستان میں جو آئین سازی ہوئی ہے اس کے اندر یہ یہ کفریہ شقیں شامل ہیں۔ اس ساری

صورت حال میں جو سوالات کھڑے کئے جا رہے ہیں یا جو کفر یا تکفیر کا بیانیہ دیا جا رہا ہے اس کے مقابلے میں ایک متبادل مذہبی بیانیہ تیار کرنے کے لئے طبقہ علماء اپنی ذمہ داری سمجھ کر بحث میں شریک نہیں ہو رہے۔ ضروری سوالات کے جواب دینے اور مشکلات کے حل کرنے کے لئے وہ احساس نمایاں نہیں ہو رہا جو کہ ہمارے علمائے سلف کا خاصہ تھا۔ اب جو متشدد رویہ یا بیانیہ سامنے آیا ہے اس کی حمایت میں نوجوانوں کا ایک طبقہ مرنے اور مارنے کے لئے تیار ہے۔ ان کے پیچھے ایک مذہبی اور فکری تصور ایک قوت کی شکل میں موجود ہے، لہذا علماء کا فرض ہے کہ وہ آئیں اور ان کے سوالات کا جواب دیں۔ ملک اور معاشرے کو بچانے اور متشددانہ رویئے کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں۔

ایک سوال میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ کیا صورت حال ایسی تھی یا نہیں یا میں غلط کہہ رہا ہوں کہ لوگوں کو چیخ چیخ کر کہنا پڑا کہ علماء اس ضمن میں کوئی واضح مؤقف کیوں نہیں پیش کر رہے، وہ خاموشی اور گومگوں کا شکار کیوں ہیں۔ معاشرے، ریاست اور عوام کو یہ کہنا پڑا کہ اس متشددانہ مؤقف کے رد میں علمائے کرام اپنا استدلال کیوں نہیں پیش کر رہے۔ لیکن عرصہ تک خاموشی طاری رہی مگر تشدد کے بدترین واقعات کے بعد پھر کچھ احساس پیدا ہوا اور قدرے یکسوئی پیدا ہوئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ علماء کو یکسو ہونے اور جوابی بیانیہ پیش کرنے میں کیا دقت پیش آئی۔

اس ضمن میں جو بحث چل رہی ہے اصل میں اس بحث کے پیدا ہونے سے پہلے مذہبی ذہن میں ایک تقسیم پیدا ہو چکی تھی اور اس تقسیم میں ہمیں پچھلے بیس سال کے حالات اور عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ افغانستان میں نفاذ اسلام کا ایک ماڈل سامنے آیا جس کے بعض محاسن سے مذہبی ذہن متاثر ہوا۔ چونکہ پاکستان میں حکمران طبقے کی دوعملی یا منافقت کی وجہ سے مایوسی کی ایک کیفیت تھی جبکہ وہاں حکومت کا وہ تصور سامنے آیا جو کہ ایک بڑے حلقے کے مطابق اسلام سے قریب تر تھا جس کی وجہ سے اس تصور کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی۔ پاکستان بننے کے بعد تمام مکتب فکر کے صف اول کے 30 سے زائد علماء نے جو دستوری نکات اور خاکہ پیش کیا اس میں تصور حکومت کا وہ ماڈل نہیں تھا جو ہم نے 95ء اور 96ء میں افغانستان میں دیکھا۔ یہاں جو ماڈل علماء نے اپنایا اس میں رائے دہی یعنی ووٹ کا تصور، جمہوریت ہے یا انتخابات، حکمران کی جوابدہی وغیرہ ہے۔ تو

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں جو علماء نے فیصلہ کیا کہ ہمیں جدید دور میں اگر کوئی اسلامی ریاست بنانی ہے تو وہ اصلاً جمہوریت کے اصول پر مبنی ہوگی۔ کیا اس غور وفکر اور سوچ و بچار میں کوئی کمی تھی یا انہوں نے اس نظام سے جو توقعات وابستہ کی تھیں اب جمہوری سفر کے بعد اس کا ادراک ہوا کہ وہ پوری نہیں ہوئیں، یا ان توقعات کے غیر حقیقی ہونے سے یہ تصور پیدا ہوا کہ یہ جمہوری نظام وہ توقعات پوری نہیں کر سکتا لہذا ہمیں اس ماڈل کی ضرورت ہے جو کہ افغانستان میں سامنے آ رہا ہے۔ یہاں پر علماء نے اسلام اور جمہوریت میں مطابقت کی جو کوششیں کی تھیں اس کا انجام 1973ء کے متفقہ آئین کی صورت میں سامنے آتا ہے جس کی تشکیل میں علماء وقت کا اہم کردار رہا ہے۔

اس بحث کے دوران ایک مؤقف یہ سامنے آیا ہے کہ علماء نے جو کردار قیام پاکستان کے بعد ادا کیا وہ حالات کے جبر یا کسی مجبوری کی وجہ سے تھا، کیوں کہ وہ دونوں طبقات یعنی سیکولر جمہوری اور مذہبی عناصر کو ساتھ ملا کر چلنا چاہتے تھے۔ یہ الگ بحث ہے کہ جن علماء نے دستوری نکات پیش کئے کیا انہوں نے اضطراری حالت میں ایسا کیا یا سوچ سمجھ کر جمہوری نظام سے مفاہمت کی، جس کے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہوئے۔

علمائے کرام کی ان کاوشوں کا نکتہء آغاز 1949ء کی قرارداد مقاصد ہے، اگرچہ اس سے پہلے علماء تقسیم ہندوستان کے معاملہ پر باہم اختلافات رکھتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے الگ وطن ضروری ہے یا متحدہ ہندوستان ہی میں رہ کر اپنے مفادات کا بہتر تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ علماء کی داخلی بحث میں یہ سوال بھی بہت ابھر کر سامنے آتا تھا کہ نئی ریاست کے قیام کے بعد نفاذ اسلام کی جو توقع کی جا رہی ہے وہ پوری ہوگی یا نہیں۔ اس کے جواب میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا یہ مؤقف تھا کہ ہمیں یہ توقع ہرگز نہیں ہے کہ یہاں ہماری جدوجہد سے معیاری اسلامی نظام قائم ہو۔ ہم یہ کوشش اس لئے کر رہے ہیں کہ آزادی کے بعد جیسے بھی ہم نظام اسلام کے قیام کے لئے کاوشیں کر سکتے ہیں یا مسلمانوں کے مفاد کے لئے جو کام کر سکتے ہیں وہ کرنا چاہئے، ہمیں سیکولر قوتوں کے لئے میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ طبقہ علماء کا اگر شروع سے یہی مؤقف تھا اور یہی توقعات تھیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ طالبان کے ماڈل کے ساتھ ہمدردی کا جواز موجود ہے۔ چونکہ ایک مؤقف آپ حضرات کی طرف سے یہ بھی سامنے آیا ہے کہ اب تک کے جمہوری سفر میں علماء کی شرکت دفاع اسلام کے لئے

ہے کیونکہ وہ یکسر میدان خالی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

اب ہم آگے بڑھنے سے پہلے اس پورے تجزیے میں جس میں آپ حضرات کی آراء شامل کی گئیں ہیں یہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ جو منظر ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ابھی تک طبقہ علماء حکمت عملی کے حوالے سے پوری طرح یکسو نہیں ہیں۔ ہماری خواہش طالبان کی طرز کا یا جیسے ایک ساتھی نے جنرل ضیاء الحق کے نفاذ اسلام کے اقدامات اور نظام شوریٰ کے قیام کا ذکر کیا ہے جیسے ماڈل کو اپنانے کی ہے، جمہوریت کے ساتھ ہمارا سفر حالات کے جبر کے تحت ہے۔ چونکہ ہماری خواہش یہ ہے اور ہم نے حالات کے مطابق موجودہ جمہوری نظام کے ساتھ چلنا بھی ہے ہم خاموش رہ کر نہیں بیٹھ سکتے، لہذا حالات یا مختلف زمانوں میں مختلف قوتیں جیسا بھی ماحول پیدا کریں ہم وقتی طور پر اس کے ساتھ مصالحت کر لیں اور جیسے ہی ہماری خواہش کے مطابق کوئی ماڈل سامنے آتا ہے ہم ادھر جھک جائیں۔ گویا حالات کا جبر زیادہ غالب ہوگا تو ہم جمہوریت کے ساتھ چلتے رہیں گے۔ ایک حد تک یہ بات ٹھیک ہے کہ جو علماء سیاسی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں وہ ظاہراً جمہوریت کے ساتھ ہیں اور جو مدارس کے اندر تعلیم و تدریس کا کام کر رہے ہیں وہ طالبان یا شورائیت ماڈل کے حامی ہیں۔ ان کے ہاں جمہوریت یا جبر کے پہلو کا ادراک نہیں ہے، لیکن کلیتًا ایسا نہیں ہے ان کے ہاں حتمی طور پر ایسا مؤقف نہیں اختیار کیا گیا۔

اس ضمن میں جماعت اسلامی کے طرز مؤقف کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ مولانا مودودی صاحب کی جتنی فکری کاوش و جدوجہد ہے انہیں روایتی علماء سے بہت پہلے اس کشمکش کا ادراک تھا۔ انہوں نے بہت پہلے اسے موضوع بنا کر اپنی تحریروں میں اس سوال کا جواب دے کر یہ حتمی مؤقف اختیار کیا کہ موجودہ دور میں ایک جمہوری ریاست میں جمہوریت سے ہٹ کر کسی اور طریقے سے جدوجہد کرنا جائز نہیں۔ ایسی وضاحت اور صراحت پاکستان میں سیاسی جدوجہد کرنے والے جتنے بھی سیاسی و مذہبی مفکرین ہیں ان کے ہاں نہیں ملتی۔ یہ ساری گفتگو مولانا مودودی نے 1956ء کی دستور سازی کے تناظر میں کی ہے۔ ان کے نکتہ نظر سے اختلاف رکھنے والے ڈاکٹر اسرار احمد نے تنظیم اسلامی کے نام سے الگ تنظیم قائم کی۔ جمعیت علمائے اسلام کے رہنماؤں کی 1956ء کے آئین کے حوالہ سے خط و کتابت موجود ہے جس میں ان کا مؤقف تھا کہ اسے تسلیم نہیں

کرنا چاہئے۔ مولانا مودودی کا مؤقف تھا کہ ہمیں اسی آئینی حد میں رہ کر جدوجہد کرنی ہے۔ لیکن تمام مذہبی گروہوں میں دیوبندی مکتب فکر کے علاوہ اگر کسی اور گروہ کی نوجوان نسل طالبان کے بیانیہ سے متاثر ہوئی ہے وہ جماعت اسلامی ہے۔ اگرچہ فکری طور پر ان کے بڑے طبقے میں جمہوریت کی حمایت واضح ہے اور جماعت اسلامی کے پرانے لوگ طالبان کے بھی ناقد رہے ہیں، مگر بعد میں جماعت کے امیر سید منور حسن اور نئی نسل میں کے دیگر لوگوں کا مختلف مؤقف رہا۔

ایک اور مؤقف بھی سامنے آیا ہے کہ تمام مذہبی مکاتب فکر کے نوجوان، حتیٰ کہ ابھی بریلوی مکتب فکر کی طرف سے مولانا خادم حسین رضوی کی جدوجہد کے نتیجے میں ان کی طرف مائل ہونے والے نوجوان طبقے کا بیانیہ پرانے مذہبی رہنماؤں کے جمہوریت کے ساتھ مصالحت پر مبنی رویئے کے برعکس ہے۔ ان دونوں حوالوں سے اس پر غور ہونا چاہئے کہ اس سارے پس منظر میں علماء کی کیا ذمہ داری ہے اور انہیں اس ضمن میں کیا مؤقف اختیار کرنا چاہئے۔ جیسا کہ یہاں یہ نشاندہی ہوئی کہ دیوبندی مکتب فکر اور جماعت اسلامی کے علاوہ بریلوی مکتب فکر جو عموماً ان معاملات میں نرم روی پر گامزن رہے، جمہوری نظام سے مصالحت کے بیانیہ سے انحراف کر کے بزور طاقت اپنے بیانیہ یا مؤقف کو منوانا چاہتے ہیں۔ کیا اس کا شرعی جواز موجود ہے اور اس راستے پر گامزن ہو کر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے یا نہیں۔

اور دوسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جمہوری راستے سے ہم جو نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے امکانات موجودہ عالمی تناظر اور عالمی دباؤ وغیرہ کے باعث بہت کم رہ گئے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ہمیں کوئی بیانیہ سامنے لانا ہوگا۔ جیسا کہ پہلی صدی ہجری میں خوارج کے مؤقف کے حوالے سے علماء کا ایک بیانیہ سامنے آیا جس میں دونوں اطراف کے غلط اور درست مؤقف یا عملی اقدامات کی نشاندہی کی گئی۔ جہاں خوارج کے مؤقف اور ان کے عملی اقدامات کی مذمت اور نفی کی گئی، وہاں ساتھ ہی حکمرانوں کے غلط طرز عمل، غلط اقدامات اور ظالمانہ طرز حکومت کی بھی مذمت اور نشاندہی کی گئی۔ آج بھی تشدد کے بیانیہ اور حکمرانوں کے کردار اور اقدامات کو اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اسی طرح کے سوال آج بھی درپیش ہیں جن کا جواب تلاش کرنا ہے۔ اس پر اہل علم کے واضح مؤقف اور استدلال کی ضرورت ہے۔

سوال: ہم تشدد کے بیانیہ کے حوالے سے بات کر رہے تھے، ہماری مقتدر قوتیں ایک طرف تو تشدد کے بیانیہ کی حمایت کرتی ہیں اور دوسری طرف جب ان کی مرضی ہو اس پر قدغن یا پابندیاں بھی عائد کر دی جاتی ہیں۔

جواب:۔

یہ بات درست ہے لیکن ہمیں سارے پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر، غور وفکر کے بعد ایک مذہبی بیانیہ اپنانا ہوگا۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ وہ یہ کر رہے ہیں، وہ کر رہے ہیں، اس لیے ہمیں بھی مخالفت کرنی چاہیے۔ اس صورتحال میں بھی ہم بطور علماء اپنی ذمہ داریوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ جاری گفتگو میں یہ سارے پہلو شامل ہونے چاہئیں کہ کیا تشدد کے راستے پر جانے سے شرعی یا اخلاقی اصول مجروح ہوں گے یا نہیں۔ کیا آپ کسی اور کے مقاصد کے لئے آلہء کار تو نہیں بنیں گے۔ کیا اس کی کامیابی کا امکان ہے یا نہیں، آپ کے پاس طاقت نہیں تو آپ کی اپنی ترجیحات ہیں وہ آپ کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرے گی۔ ان تمام مضمرات پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔

اسلام اور جمہوریت کی بحث ایک طویل بحث ہے۔ مفکرین نے اسلام، پاکستان کی تاریخ اور علمائے کرام کے کردار کے حوالے سے مفصل گفتگو کی ہے۔ 1950ء کے عشرے میں علماء کے پیش کردہ 22 نکات کا حوالہ اور موجودہ صورت حال کے تناظر میں سوچ وفکر کے امکانات علمائے کرام کے سامنے رکھ دیئے ہیں، امید ہے کہ وہ اس پر غور وفکر فرمائیں گے۔ پوری نشست کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء کرام سیاسی فریق بنے بغیر ایک احساس ذمہ داری کے ساتھ اس دور کے فکری تقاضے کے مطابق آج کی نوجوان نسل جو تشدد کے بیانیہ کی طرف راغب ہے یا دیگر جو مذہبی وسیاسی طبقات وگروہ جمہوریت کے حق یا مخالفت میں اختلاف رکھتے ہیں کی علمی وفکری واجتہادی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں۔

اہم جمہوری اقدار: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

مفتی ثناءاللہ

ایم فل۔ اسٹنٹ پروفیسر اسلامک سٹڈیز، بی یو آئی ٹی ایم ایس، فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

کوئی بھی معاشرہ اعلیٰ اخلاقی اقدار اور اصولوں کو اپنائے بغیر ترقی نہیں کرسکتا۔ وہ اعلیٰ اخلاقی جمہوری اقدار جس پر ترقی یافتہ مغربی اقوام فخر کرتی ہیں، ہم اس نشست میں ان اقدار کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

انصاف:

جمہوریت اور جمہوری معاشروں میں عدل وانصاف پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ جب کہ دین اسلام نے آج سے کئی سو سال پہلے اس کی اہمیت کو بیان کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انصاف کے بارے میں فرمایا: کہ اگر آپ کے کوئی رشتہ دار ہیں یا کوئی تعلق دار ہیں، تو آپ اس وجہ سے یا اس تعلق خاطر کی بدولت انصاف سے گریز نہ کریں اور عدل کرو کہ یہ تقویٰ ہے۔ جو انصاف نہیں کرتا وہ ظالم ہے۔ جب ہم معاشرے میں انصاف کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہمارے ملک میں انصاف نہیں ہے۔ ہمیں پہلے اپنے آپ سے آغاز کرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ کیا میں گھر میں انصاف کرتا ہوں، بیوی بچوں اور رشتہ داروں میں میرے کیا معاملات ہیں، دیگر افراد سے میں کیسے سلوک کرتا ہوں۔ اگر میں ادارے چلاتا ہوں یا کہیں منتظم ہوں تو میں اپنی ذمہ داریوں اور ادارے کے ساتھ کتنا انصاف کرتا ہوں۔ انصاف کا حکم سب کے لئے ہے، چاہے وہ حکمران ہوں یا علماء کا طبقہ ہو یا عام آدمی، انفرادی واجتماعی سطح پر اور ہر گھڑی انصاف کا پہلو مدنظر رکھنے کا حکم ہے۔ نبی کریم ﷺ کا

اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ایک روایت جو آپ جانتے ہیں کہ ایک بااثر آدمی کی بیٹی نے چوری کی تو لوگوں نے کہا کہ اگر اس پر حد کا نفاذ ہوا تو یہ لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں گے کہ بڑے آدمی کی بیٹی کو سزا ملی ہے، تو آپ ﷺ کے جو الفاظ تھے وہ تمام انسانوں کے لئے ایک سبق کا درجہ رکھتے ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خدا کی قسم اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کو بھی سزا ملتی۔یہی حقیقی انصاف ہے۔

میں اگر خطیب ہوں منبر پر بیٹھ کر انصاف کی بات کروں تو پہلے ضروری ہے کہ میں اپنی ذاتی و معاشرتی زندگی میں انصاف کے تقاضوں پر پوری طرح عمل پیرا ہوں ،تو پھر یہ بات مجھے جچتی ہے کہ میں انصاف کا درس دوں۔ نبی کریم ﷺ نے جو درس بھی دیا پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا یہ نہیں کہ ذاتی زندگی میں کوئی اور معیار رکھا اور امت کو کچھ اور درس دیا۔

آزادی وخودمختاری:

فطری طور پر انسان آزاد پیدا ہوا ہے اس کی فطرت میں آزادی ہے، وہ قید اور پابندی کو قبول نہیں کرتا۔ یہ آزادی اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے۔آپ اس ملک میں رہتے ہیں تو یہاں آپ کو ہر طرح کی جمہوری آزادی حاصل ہے۔جمہوریت میں آپ کو مختلف آزادیاں حاصل ہوتی ہیں۔آپ کو آزادانہ حرکت اور اظہار رائے کی مکمل آزادی حاصل ہے۔شخصی آزادی جمہوریت کا حسن ہے۔آپ جس علاقے میں رہنا چاہتے ہیں آپ رہ سکتے ہیں۔اسی طرح سیاسی طور پر آزاد ہیں، آپ کے ذہن میں جو بھی سیاسی مؤقف ہے آپ اس کا اظہار کر سکتے ہیں اپنی اپنی وابستگیاں سیاسی گروہ یا جماعت کے ساتھ قائم کرنے میں آزاد ہیں۔ یہ بھی جمہوری نظام کی ایک خوبی ہے کہ میرے گاؤں میں ایک گھر میں تین تین جھنڈے مختلف پارٹیوں کے لگے تھے۔اور یہ بھی آزادی ہے کہ آپ کے منتخب کردہ نمائندے پارلیمنٹ میں جا کر اپنے مؤقف کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ہم اقتصادی طور پر بھی آزاد ہیں ہم کسی بھی جگہ جا کر کوئی بھی کاروبار کر سکتے ہیں اس پر کوئی قدغن نہیں ہے۔حکومت اس میں دخل اندازی نہیں کرتی کہ آپ یہ کاروبار کیوں کر رہے ہیں۔

اسی طرح اختیار مذہب اور اپنے اپنے مذہب پر عمل کی بھی جمہوریت میں آزادی ہے اور اسلام کا

بھی یہی نکتہ نظر ہے۔ دین اسلام کو اختیار کرنے کے لئے غیر مسلموں پر کوئی جبر نہیں۔ لا اکراہ فی الدین کہ دین کے اختیار میں کوئی جبر نہیں۔ لوگوں کو دین کی طرف بلائیں لیکن آپ ان کی ہدایت کے مکلّف نہیں ہیں، جبر کے ذریعے دین اختیار کرنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے۔ یہی منہج نبوی ﷺ ہے۔ کردار، محبت اور ہمدردی کے احساس سے ہی دعوت کا کام کر سکتے ہیں۔ نہ ہمیں دین نفرت سکھاتا ہے اور نہ ہی جمہوریت ہمیں نفرت سکھاتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں رویوں کا مسئلہ ہے، ہمارے ہاں برداشت نہیں، ایک دوسرے کی رائے، مؤقف اور نقطہ نظر کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ اپنے مسالک کے مخالفین یا دوسرے مسلک کے لوگوں کے ساتھ ہمارا جو رویہ ہے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا آپ ﷺ کا رویہ اور طریق کار یہی تھا۔

جمہوریت میں آپ کے پاس خود مختاری ہے۔ آپ اپنے نمائندے منتخب کرنے اور ان کے ذریعے قانون سازی کرنے کے لئے خود مختار ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کو منتخب کر سکتے ہیں جو ہماری رائے اور مرضی کے مطابق قانون سازی کریں۔ جمہوری نظام میں ایک دوسرے کے جان و مال و عزت کی تحفظ کی بھی پوری ذمہ داری کی گئی ہے، اس سلسلے میں بھی قوانین، نظام اور ادارے موجود ہیں۔ اگر ہم بطور مسلمان اپنی اپنی زندگیوں میں اسلام کے احکامات کو نافذ کریں تو ہمارے لئے ایک دوسرے کی جان و مال و عزت و آبرو کا نقصان حرام ہے جیسا کہ حدیث پاک میں کہا گیا کہ جس نے جان بوجھ کر کسی انسان پر قتل کیا گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا۔ کسی انسان پر جبر کی اجازت بھی نہیں۔ حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا ہے تو تمہیں انہیں غلام بنانے یعنی ان پر جبر کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

مساوات:

اسی طرح جمہوریت میں قانونی طور پر تمام لوگوں کو مساوات حاصل ہے۔ قرآن و حدیث کے نکتہ نظر کے مطابق بھی بار بار مساوات پر زور دیا گیا ہے۔ تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا گیا ہے۔ انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا اس میں بھی ارشاد فرمایا کہ کسی گورے کو کالے، کالے کو گورے، عربی کو

عجمی اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت یا فوقیت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔ کون زیادہ تقویٰ رکھتا ہے اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کسی انسان کو اس کے تعین کا اختیار نہیں۔

خوشی کا حصول:

اسی طرح انسانوں کے درمیان تنوع ہے۔ قرآن میں ہے کہ تمہیں قوموں، قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم کیا ہے یہ صرف باہم تعارف کے لئے ہے نہ کہ اس کی بنیاد کسی برتری پر ہے۔ آپ اس نظام کے اندر خوشیوں کا حصول بھی چند حدود کے اندر رہ کر کر سکتے ہیں۔ مثلاً شادی کی تقریبات وغیرہ ہیں لیکن وہاں پر ایسا شور شرابا اور فائرنگ نہ ہو جن سے دوسرے تکلیف میں مبتلا ہوں۔ حدیث پاک میں ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔ پھر فرحت اور خوشی کے حصول کے لئے بھی کہا گیا کہ اپنے دلوں کو کبھی کبھی فرحت پہنچایا کرو مگر جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے، نہ کہ دوسروں کو تکلیف و آزار دے کر یا احکام شریعت کی کھلی خلاف ورزی کر کے خوشیاں منائیں اور تفریح کے مواقع حاصل کریں۔ شرعاً و قانوناً دونوں اعتبار سے آپ کو تفریح کا حق حاصل ہے۔

حق کا ساتھ:

قرآن میں کہا گیا ''یا ایھا الذین امنو کونو مع الصدیقین: اے ایمان والو، سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ'' تو جمہوری نظام کے اندر آپ ہمیشہ سچے لوگوں کا ساتھ دیں۔ ایسے لوگوں کو منتخب کریں جو سچائی اور اصول کا ساتھ دینے والے ہوں۔ آپ ان سے یہ بھی پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آپ کے پاس جو وسائل ہیں، جائیداد اور گاڑیاں ہیں یہ کن ذرائع سے آپ کے پاس آئی ہیں۔ امیر المومنین سے عام شہری یہ سوال کر سکتا ہے کہ آپ کا کرتا کہاں سے آیا ہے۔ جمہوری طور پر بھی اور شرعاً بھی آپ کو ان سوالات کا حق بطور شہری حاصل ہے۔ اگر آپ دوسروں سے سچ کی توقع رکھتے ہیں تو آپ کو خود بھی سچ بولنا ہوگا۔ مجھے بھی اپنی سطح پر سچائی اور اصولوں کو اپنانا ہوگا۔ جو چیز اپنے لئے پسند کرے وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرے۔

وطن کی محبت:

مجھے اپنے ملک یا وطن میں یہ تمام آزادیاں حاصل ہیں جن کا بیان ہوا ہے۔ ہمیں دوسرے ممالک میں اتنی آزادیاں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ یہ اپنے وطن کی وجہ سے ہے کہ ہم یہاں ہر طرح سے اظہار رائے کر سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں ہے۔ اسی طرح اسے بھی حدیث کہا گیا اگر چہ اس پر اختلاف ہے لیکن بات ہر گز غلط نہیں ہے کہ حب الوطن من الایمان کہ وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔ آپ ﷺ نے ہجرت مدینہ کے وقت خانہ کعبہ اور مکہ مکرمہ سے جس طرح اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ شریعت ہمیں یہی سکھاتی ہے۔ آپ ﷺ کی ایک دعا یہ بھی ہے کہ اے اللہ جیسے ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں مدینہ کو بھی ہمارے لئے بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب بنادے۔

قانون کی حکمرانی:

قانون کی حکمرانی جمہوری نظام کا حسن ہے۔ جب صحیح معنوں میں نظام جمہوری ہو یعنی مثالی جمہوریت ہو تو وہاں قانون کی حکمرانی یقینی ہوگی۔ شریعت نے بھی قانون کی پابندی اور پاسداری شہریوں کے لئے فرض قرار دی ہے۔ مثلاً فقہی قانون کے مطابق ٹریفک کے قوانین پر عمل کرنا محض ہمارا قانونی فرض ہی نہیں شرعی فرض بھی ہے۔ اسی طرح اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے تمام قوانین شریعت کے مطابق ہوں تو اس میں بھی ہمیں آزادی حاصل ہے کہ ہم اپنے نمائندوں کے ذریعے ملک کے قوانین کو شریعت کے مطابق بنائیں۔ ہم ایسے لوگوں کو آگے لائیں جو شرعی قوانین بنا سکتے ہوں۔ جسٹس مولانا تقی عثمانی صاحب نے ایک نہایت تلخ حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایک طویل عرصہ شریعت اپیلیٹ بینچ سپریم کورٹ کے جج رہے ہیں۔ وہ مذہبی سیاسی رہنماؤں اور علماء سے خود جا کر یہ کہتے رہے ہیں کہ آپ شرعی قوانین اور ان کے نفاذ کے لئے ٹھوس تجاویز یا مدلل کیس تیار کر کے لائیں ہم ان پر اپنے فیصلے اور سفارشات کو ریاست کے سامنے پیش کریں گے۔ لیکن طویل عرصہ میں کسی ایک صاحب نے بھی ایسا نہیں کیا۔ گویا ہم عوام میں دعوے، نعرے، اعلانات اور مطالبات پیش کرتے رہتے ہیں لیکن ان کے لئے کسی عملی حکمت عملی اور عملی کام کرنے سے پس و پیش کرتے ہیں، گویا اسلام کو محض سیاسی نعروں کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

مذہبی آزادی کا تصور

شہزادہ ذوالفقار

سینئر صحافی ، بلوچستان

میرے لیے یہ پہلا موقع ہے کہ میں دین کا فہم رکھنے والے قابل احترام سامعین سے مخاطب ہوں۔ اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں ہر چیز کو دین کی عینک سے دیکھنے کی روایت ہے۔ آپ مسلمان ہیں تو بالکل اپنی ذاتی زندگی اسلام کے اور دین کے مطابق گزاریں، لیکن اگر ہر چیز کو دین کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں گے تو اس میں لامحالہ تصادم آئے گا اور شکوک وشبہات پیدا ہوں گے۔ تو پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ مولوی حضرات یہ شدت پسند ہیں، یہ ایسے لوگ ہیں، یہ ویسے لوگ ہیں، تنگ نظر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جس کے جو ابی بیانیہ کے طور پر اعتراض کرنے والوں کے بارے میں ڈالر کھانے والے، این جی اوز مافیا اور ضمیر فروش وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے جائیں گے۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم تمام طبقات ان امور پر مکالمہ اور گفتگو کریں۔ اپنا اپنا نکتہ نظر پیش کریں، دوسروں کا سنیں، کیونکہ اختلاف رائے آپ کا حق ہے۔ اسی صورت میں ہم ایک دوسرے کے لئے قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ جب ہم کسی بات کو کھلم کھلا رد کرتے ہیں تو شدت پسندی کی طرف جاتے ہیں اور تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں، کیونکہ ہم یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ دوسرے کو بات کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

مذہبی آزادی، جمہوریت میں ہو یا مغرب میں، اس کی پاسداری لازمی ہے۔ ضروری نہیں کہ مغرب میں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے، کیونکہ فرانس میں سکارف پر جو پابندی لگی اس سے مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوئی حالانکہ وہ اپنے آپ کو لبرل اور انسانی حقوق کا چمپئن کہتے ہیں تو شخصی آزادی کو سلب کیوں کر رہے ہیں۔ جو کبھی فرانس، یورپ یا امریکہ نہیں گئے وہ یہاں بیٹھ کر یہ کہیں گے کہ کفر کبھی اسلام کا دوست نہیں ہو سکتا۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہم نے خیالی طور پر تصور کر لیا ہے۔ یہ ساری تبدیلی مغرب میں 9/11 کے بعد

آئی ہے۔ مجھے اس سے پہلے کئی بار ڈنمارک جانے کا اتفاق ہوا، مگر اسی طرح ڈنمارک میں بھی بڑا فرق آ چکا ہے۔ اگر ہمارے ہاں شدت پسندی ہے ان کے ہاں بھی ہے۔ اسلاموفوبیا کے شکار لوگ جس طرح آگ اگلتے ہیں وہ تمام مسلمانوں کے لئے تشویش اور افسوس کا باعث ہے، ان کے نزدیک ہر برائی کی وجہ اسلام ہے۔ یہ پوچھنا بجا ہے کہ ہر داڑھی والا دہشت گرد کیسے ہوسکتا ہے۔ 9/11 سے پہلے اور بعد میں مجھے امریکہ جانے کا موقع ملا، وہاں سے بھی ان کے لوگ یہاں آتے رہے ہیں جن سے بات چیت ہوتی رہتی ہے ان کا بھی یہی موقف تھا کہ واقعی ہر داڑھی والا دہشت گرد نہیں ہے۔

مذہبی آزادی کے حوالے سے جب ہم اپنے ملک کو دیکھتے ہیں، تو بتائیں کہ کیا ہمارے ملک میں کسی کرسچین تنظیم کو یہ آزادی ہے کہ وہ اپنے مذہب کا پرچار کرے، قطعاً نہیں، حالانکہ آئین نے انہیں یہ آزادی دے رکھی ہے۔ جب انگریز یہاں پر تھا تو بلوچستان میں بہت سے خاندانوں کو بسایا گیا۔ تعلیم کے میدان میں عیسائی مشنری سکولوں کی بڑی خدمات ہیں۔ وہاں مغرب میں ہر ایک عمل کا ردعمل ہوا اور مسلمانوں کے خلاف کریک ڈاؤن ہوا۔ 9/11 کے بعد یہ کہا گیا کہ سب فساد کی جڑ مسلمان ہیں۔ چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی پاکستان افغانستان کی لڑائی میں فرنٹ لائن سٹیٹ بنا جس سے کافی مسائل پیدا ہوئے۔

اگر مغرب میں وہ سکارف کے پردے کی اجازت نہیں دیتے تو یہاں بھی ہم انہیں اپنی مرضی کے مطابق آزادروی کی اجازت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ یہ اسلامی ملک ہے اس میں یہ نہیں ہوسکتا۔ پھر ہمیں جوابی طور پر یہ سب برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر سب لوگ بنیاد پرستی پر ڈٹ جائیں تو اس کا کوئی حل نہیں نکلے گا۔ میں ایک ویڈیو دیکھ رہا تھا کہ ایک عرب ملک کے مرد اور عورتیں برطانوی پولیس کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور ایک عورت اپنے پردے میں وہاں نمایاں ہے۔ پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بیٹھ کر ہی ہمارے خلاف بات کر رہے ہیں، ہمارے قانون کو چیلنج کر رہے ہیں۔ برطانوی پولیس اس کے باوجود انہیں اس بات کی اجازت دے رہی ہے کہ ایک شخص پارک میں کھڑے ہو کر جس کے خلاف یا حق میں جو مرضی بات کرے یا اسی ملک کا جھنڈا اپنے پاؤں میں لپیٹ کر وہاں سے نکل جائے، اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوتی۔ یہ تصور شاید ہمارے ملک میں بھی نہیں ہے۔ یہاں ملک کے جھنڈے پر، اسلامی تعلیمات پر اعتراض اور آپ ﷺ کی

شان پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہے اور ایسا ایک اسلامی ملک میں درست ہے۔ لیکن بغیر تحقیق کے گستاخی کا الزام لگا کر قانون ہاتھ میں لینا اور اداروں کی مدد کے بجائے اپنے ہاتھ سے کاروائی کرنا یہاں پر اپنا حق سمجھا جاتا ہے۔

آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن مولانا طارق جمیل صاحب اور مولانا الیاس عطاری صاحب نے قانون ہاتھ میں لینے سے منع کیا ہے۔ آپ ﷺ کی تو ارفع شان ہے، ہم اپنے قومی مذہبی رہنماؤں پر اعتراض کرنے والوں کو بھی اپنے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ ایک مذہب یا مسلک کو اختیار کر کے اس کے ضابطوں کی پاسداری کرتے ہیں، تو اسی طرح ملکی قوانین کے دائرے میں رہنا اور ان کی پاسداری کرنا آپ کا فرض ہے۔

جمہوریت میں اجازت ہے کہ آپ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کریں اور آزادی رائے کا اظہار کریں، اسی طرح دوسرا بھی یہی چاہتا ہے۔ یہ نہیں کہ آپ دوسروں پر پابندی چاہتے ہیں اور صرف اپنے آپ کے لیے ہر قسم کی آزادی کے حصول کا مطالبہ کریں۔ میں مغرب یا جمہوریت کا دفاع نہیں کر رہا لیکن وہاں مساجد کے قیام اور مذہبی سرگرمیوں کی آزادی حاصل ہے بلکہ بعض ممالک میں اس کے لئے فنڈز بھی دیئے جاتے ہیں۔

جمہوریت کی بطور نظام بات کی جائے تو کوئی نظام بذات خود برا نہیں ہوتا۔ ایک مکمل اسلامی شرعی نظام میں کوئی نا اہل شخص لگا دیا جائے تو اس کی نا اہلیت کی وجہ سے لوگ شرعی نظام سے متنفر ہو جائیں گے۔ جمہوری اقدار جیسے رواداری اور برداشت کا فروغ ہی بہتری لا سکتا ہے اور اس کے لئے علماء اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مغرب میں مذہبی آزادی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ ہماری تبلیغی جماعت کے لوگ سال میں کئی دفعہ یورپ اور امریکہ جاتے ہیں اور دنیا کے دیگر ممالک میں بھی جاتے ہیں۔ یہ جماعت کی صورت میں ویزہ کے لیے درخواست دیتے ہیں تو وہاں تبلیغ کا ہی مقصد تحریر کیا جاتا ہے نہ کہ سیاحتی ویزہ لیا جاتا ہے، انہیں وہاں جانے اور تبلیغ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ہاں البتہ حالیہ سالوں میں کبھی کبھار یہ ہوا ہے کہ جب وہ جماعت کی شکل میں گھومتے ہیں تو کوئی آوازیں لگاتا ہے، ورنہ پہلے یہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی عوامی سطح پر اکا دکا

واقعات ہوتے ہیں، رہائشی سطح پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہاں عوام کی اکثریت ایسے افراد کی مذمت کرتی ہے۔ لوگ لبرل ہیں وہ ہر ایک کی بات سننے کو تیار ہوتے ہیں۔ مذہبی آزادی آگے چل کر وہاں کیا صورت اختیار کرتی ہے، لیکن وہاں کی اکثریت رواداری اور برداشت کا مظاہرہ کرتی ہے، ایسا نہ ہوتو ہم وہاں کوئی بھی مذہبی سرگرمی نہیں کر سکتے۔

لوگوں کے گھروں میں مذہبی اجتماعات ہوتے ہیں، نماز اور جماعت ہوتی ہے لیکن اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ مسلمانوں میں بھی بڑی تعداد وہاں اسلام کی بنیادی اقدار پر مکمل عمل کر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بھی ایسی آزادیوں کو اپنے ہاں فروغ دینا چاہئے۔

رانا محمد آصف

سینئر صحافی، کراچی

تربیتی ورکشاپ سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنے معلوم کو عمل میں لائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کوئی ایسی چیز سیکھتے ہیں جیسے کرسی کیسے بنائی جاتی ہے تو جب تک آپ وہ خود بنا کر عملاً تجربہ نہیں کریں گے آپ سارے عمل سے واقف نہیں ہونگے۔ تصورات کو بھی فکری سرگرمی کے ذریعے بار بار گفتگو، تحریرات اور مباحث کے ذریعے روبہ عمل لایا جاتا ہے۔ مناظرے یا مذاکرات کا جو عمل مدرسے میں اختیار کیا جاتا ہے اس سے بھی یہی تربیت ملتی ہے۔ ورکشاپ کی اصطلاح آپ کے لئے قدرے اجنبی ہوگی لیکن اس کے اندر جو طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اس پر آپ اپنے اپنے مدارس کے اندر عمل کر چکے ہیں۔

مذہبی آزادی کے عالمی قوانین یا جو بھی عالمی تناظر ہے اسے سمجھنے کے لئے مذہبی آزادی بطور تصور ہے کیا، اس کو سمجھنا لازمی ہے۔ آپ حضرات بھی اس پر رائے دے سکتے ہیں۔ مذہبی آزادی کا تصور جو عام ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق مذہب اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ و ترویج کرنے میں آزاد ہے۔ لیکن ہر ملک کے الگ قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے آزادی کا تصور تھوڑا بہت مختلف بھی ہوسکتا ہے۔ دراصل مذہبی آزادی کے تصور نے ارتقاء پذیر ہو کر ہی قوانین کی شکل اختیار کی ہے۔

مذہبی آزادی کا تصور نیا ہے اور نہ ہی یہ انسانوں کی دریافت ہے۔ آپ یہ بات زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ یہ سارا عمل کیا ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ ہر انسان کے سامنے یہ سوال ضرور ہوتے ہیں۔ چسیت عالم، چسیت آدم اور چسیت حق؟ یعنی آدمی کیا ہے، عالم یعنی کائنات یا دنیا کیا ہے اور حق یا حقیقت کیا ہے؟

مذہبی فکر کے حوالے سے اکثر یہ بحث کی جاتی ہے کہ کسی آدمی کے ذہن میں ہوسکتا ہے یہ سوال پیدا ہی نہ ہو کہ ابدی حقیقت، مذہب یا خدا کی ذات کیا ہے؟ تو یہ تصور غیر مدلل اور مجہول ہے، ابھی تک کوئی انسانی تہذیب ایسی دریافت نہیں ہوئی جہاں مذہب کا تصور موجود نہ رہا ہو۔ انسانوں کے ذہن میں یہ سوالات ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ ہر تہذیب میں مذہب یا مابعد الطبیعات کا تصور موجود رہتا ہے۔ یہ انسانوں کی قدیم ترین خواہش ہے کہ وہ ان تین سوالوں پر روز سوچتا ہے کہ آخر میں کون ہوں، یہ عالم کیا ہے اور حق کیا ہے۔ اب بھی افریقہ میں ایسے قبائل موجود ہیں جو صرف شکار پر گذارہ کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں مذہب کا مابعد الطبیعاتی تصور ضرور موجود ہے۔ جس طرح بچے کو معلوم ہے کہ اس کی بقاء خوراک سے ہے اسی طرح خدا نے یقین کر لینے کی صلاحیت بھی انسان کی فطرت میں لکھ دی ہے۔ لیکن یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ غور وفکر کے بعد حقیقت کو قبول کرے گا یا نہیں، اگر قبول کرے گا تو اس کے لئے یہ صورت ہوگی، یعنی اسے اچھے ممتحن کی طرح اس امتحان کے نتائج سے بھی آگاہ کر دیا گیا۔ علم الکلام کے علماء بھی یہ کہتے ہیں کہ یقین کرنے کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ شک کرنا انسان اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔ تاریخ کا کوئی بھی دور مذہب کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور تہذیب کی کوئی بھی تعریف اجزائے مذہب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں مذہب کا تصور واضح ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کی نوعیت کیا تھی یا مذہب کا انہوں نے صحیح یا غلط جیسا بھی استعمال کیا لیکن وہ ہر تہذیب کا مستقل جزو رہا ہے۔

ہم ایک بہت طویل سفر کو چھوڑ کر موجودہ عالمی تناظر کی بات کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا جو چارٹر ہے اس کے مطابق ہر شخص کو کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کی نہ صرف آزادی حاصل ہے بلکہ جو فرد مذہب کی شناخت اختیار کرے گا کوئی دوسرا شخص اس بنیاد پر اس سے امتیازی سلوک نہیں کر سکتا۔ یہ تو عالمی قوانین ہیں۔ اس کی تفہیم کرتے ہوئے بھی یہ نکتہ آپ کے پیش نظر رہنا چاہیے کہ یہ عالمی یا دستوری قوانین کی جو

موجودہ شکل ہے یہ نوآبادیاتی دور کی ایک یادگار ہے۔ ہمارا قانون اینگلو سیکسن لاء کی نشانی ہے۔ ہمارے ہاں فوجداری و دیوانی قوانین ہوں یا قانون شہادت ہو یا دیگر عدالتی کاروائی کا جو بھی عمل ہے وہ سب انگریزوں کے بنائے گئے قوانین اور طرزِ طریق ہے۔ یہ مسلمان بادشاہوں کے دور کے شرعی قوانین یا قاضی عدالتیں نہیں ہیں۔

جنگ عظیم دوم کے بعد اقوام متحدہ قائم ہوئی اور اس میں بھی جو اقوام شامل ہوئی ہیں وہ جنگ عظیم اول اور دوم، نیشنل ازم اور دیگر مادی تصورات کا نتیجہ تھیں۔ ریاستیں کسی نظریے اور اقدار کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتی تھیں جس کا مقصد انسانوں کی اخلاقی تربیت وغیرہ ہو بلکہ ان کی بنیاد نسل، مالی مفاد، زبان، جغرافیہ اور دیگر مادی تصورات تھے۔ ان جنگوں کی بنیاد توسیع پسندی، عصبیت، تفاخر، اجارہ داری اور تسلط کو اور زیادہ کرنا تھا۔ کروڑوں لوگ اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اقوام متحدہ کی تشکیل کا مقصد ان جنگوں کو روکنا تھا کہ ان ریاستوں کو کسی ضابطہ اخلاق اور عالمی قانون کا پابند کیا جائے تاکہ آئندہ بڑی سطح پر ایسی تباہی اور خونریزی کا سدباب ہو۔ اس لئے اقوام متحدہ کے تحت ان جنگ گزیدہ اقوام نے انسانی حقوق، انسانی آزادیوں اور بین الاقوامی اصول وضوابط کے تصورات کو مدون کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے نتیجے میں انسانی حقوق کا چارٹر سامنے آیا اور 1945ء میں اسے عالمی قانون کی شکل میں اپنایا گیا۔ تاہم مذہبی آزادی کے تصور کی پرورش بھی مذہبی ریاستوں نے کی اور ان آزادیوں پر قدغن بھی انہی مذہبی ریاستوں نے لگائی۔ مذہبی آزادی کا مطالبہ ایک مذہبی آدمی کا حتمی مطالبہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء جب بھی اپنی دعوت لیکر دنیا میں آئے تو انہوں نے کسی نہ کسی نظام کو چیلنج ضرور کیا، جس میں اس نظام کے مذہبی تصور کو بھی لازماً چیلنج کیا جاتا تھا۔ آپ دیکھیں تو انبیائے کرام علیہم السلام نے دعوت کی ابتداء میں عقائد کی درستگی اور اصلاح پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ مذہبی آدمی کا سب سے بڑا مقصود مذہبی آزادی ہوگا۔

لوگوں کو پرانے یا غلط تصورات سے نکلنے اور غور وفکر کے ساتھ صحیح مذہب کو دنیا تک پہچانے کے لئے مذہبی آزادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگر خدا اپنے آپ کو ظاہر کر دیتا تو ایمان جبر ہوتا۔ اس کا انتظام رب تعالیٰ نے خود رکھا کہ انسان اپنے شعور کو استعمال کر کے راہ حق کو قبول کرے۔ گویا یہ تصور مذہب نے خود دیا کہ انسان کو غور وفکر کرنے کی آزادی دی جائے۔ انسان کے اخلاقی ارتقاء میں ابھی تک

سب سے اہم کردار مذہب کا ہی رہا ہے۔اس آزادی کو مستحکم کرنے کے لئے اسلام نے جو تصورات دیئے ہیں ہم اس طرف آتے ہیں ۔آپ حضرات اس بارے میں زیادہ علم رکھتے ہیں اور قرآن واحادیث کی تعلیمات سے بخوبی آگاہ ہیں۔اس ضمن میں ایک اہم آیہ مبارکہ **لا اکراہ فی الدین** ہے اکراہ کا بنیادی مفہوم اختیار کا فاسد ہوجانا ہے گویا ہر انسان کو اختیار دیا گیا، جبر نہیں کیا گیا۔اسلام نے جبر کو کسی صورت میں قبول نہیں کیا۔ہمارے شرعی قوانین میں آئمہ کے ہاں ایک بحث یہ ہے کہ اسلامی ملک میں رہنے والے جو غیر مسلم ہیں ان کے عائلی قوانین میں، ان کے دیوانی اور فوجداری معاملات میں ہمارے شرعی اصول کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ جس شخص نے ان الٰہی قوانین کو اس ریاست کا باشندہ ہونے کے باوجود قبول نہیں کیا، فقہا اس کے باوجود ان قوانین کا اطلاق اس شخص یعنی غیر مسلم پر نہیں کرتے۔ اس کے اپنے مذہب یا اس کے اپنے داخلی قانون کا ہی اس پر اطلاق کیا جائے گا۔دور نبوی ﷺ میں بنو قریظہ کے بارے میں جو فیصلہ کیا گیا تو انہوں نے خود یہ کہا تھا کہ ان کی کتاب توریت کے مطابق کیا گیا فیصلہ ہی انہیں قابل وقبول ہوگا۔چنانچہ آپ ﷺ نے توریت کے مطابق غداری اور بدعہدی کی جو سزا مقرر کی گئی تھی اس کو نافذ فرمایا۔حضرت عمرؓ اور دیگر خلفاء کے دور میں بھی اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

اس اصول پر سمجھوتہ کب ہونا شروع ہوتا ہے، ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں۔مذہب کا مقصود اخلاق ہے کیونکہ اس کا مخاطب ہی انسان کا اخلاقی وجود ہوگا، مذہب کے ہاں انسانی ترقی کا تصور مادی نہیں بلکہ اس کی توجہ کا مرکز اخلاقی تربیت ہے۔وہ ریاست یا قانون جو عام انسان یا مادی انسانی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہو اس میں اخلاق ایک انتظامی مسئلہ ہوسکتا ہے۔دیانتداری ایک اچھی پالیسی تو ہوسکتی ہے لیکن محض اخلاق اور اخلاقی رویئے اس کا مطلوب ومقصود نہیں ہو سکتے۔خیر برائے خیر کا جو تصور آج ہے اس کے مطابق خیر یا اچھائی ایک تنظیمی رویہ ہے جو آپ کو منظّم رکھنا چاہتا ہے، کہ آپ منظّم ہوکر چلیں تاکہ انسانی معاشرہ بہتر خطوط پر چلتا رہے۔میں آپ کا حق اس لئے نہیں مارتا کہ کوئی میرا حق نہ مارے۔میں اس لئے قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا کیونکہ قانون اس کے نتیجے میں مجھے سزا دے گا۔اس کے برعکس مذہب کے تصور میں اخلاق مرکز اور مقصد کی حیثیت رکھتا ہے۔مذہب کے اسی تصور کو آپ مدنظر رکھیں، پھر اگر کسی شخص کی آپ نے اخلاقی تربیت

کرنی ہوتو فکری آزادی کے بغیر یہ ممکن نہ ہوگا۔

وہ آزادی جس پر کوئی قدغن نہ ہو، خواہشات کا غلام بنا دیتی ہے جو گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ آزادی کا وہی تصور کامل ہوگا جسے دینے والی اتھارٹی اس کو متعین بھی کرے گی۔ ہم کسی ایسی خواہش پر گفتگو نہیں کر رہے جو ہمیں بے آب و گیاہ صحرا میں لے جائے۔ ہم نے مذہبی آزادی کے بعینہ انہی تصورات پر چلنا ہے جن کی مثالیں ہمیں اسلام نے یا آپ ﷺ نے اپنی زندگی اور مثالوں سے واضح کی ہیں۔ اسے آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ نے شروع میں جو تین نکات بتائے، مذہبی آزادی کا اس سے باہر کوئی اور تصور نہیں اور نہ ہی کوئی روایت میں یا رویوں میں شدت ان آزادیوں پر قدغن لگا سکتی ہے۔ اسلام کا رویہ اور تعلیمات اس ضمن میں واضح ہیں۔ عالمی قوانین بہت بعد میں آتے ہیں، اقوام متحدہ کا چارٹر انہی اسلامی تعلیمات کا معکوس ارتقاء ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقوام عالم جس نتیجے پر آج پہنچی ہیں ہم بہت پہلے پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے آئین کا ابتدائیہ یعنی اس کے بنیادی 20 یا 22 آرٹیکل میں ایک فرد اور شہری کے حقوق کی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔

آپ علماء اور خطباء حضرات کا چونکہ عوام سے براہ راست تعلق ہے اور ان کی رہنمائی کا فریضہ بھی سر انجام دے رہے ہیں، لہٰذا آپ کے لئے بار بار ان آرٹیکلز کا مطالعہ از حد ضروری ہے، کیونکہ ہم بہت ساری چیزوں کو اپنا حق سمجھ رہے ہوتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں عائد ذمہ داریوں سے واقف نہیں ہوتے، پھر ہم کئی چیزوں کو لازم سمجھتے ہیں مگر اس کے نتائج سے آگاہ نہیں ہوتے۔ آرٹیکل 20 مذہبی آزادی کی بات کرتا ہے، اس کے اندر ہی مکمل نکات موجود ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔ امتناع قادیانیت ایکٹ میں استثنائی صورت کے تحت ان پر جو قدغن لگائی گئی ہے وہ آئین کے فریم ورک کے اندر ہے، اگر اس سے متصادم ہوتی تو یہ ایکٹ آئین کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ آئینی سٹرکچر میں جو چیز لکھی ہوئی ہے اس کو سمجھنے کا طریقہ بھی آئین آپ کو سکھاتا ہے، جیسا کہ اصول فقہ کے باب میں جو احکامات ہیں کہ یہ حکم لازم ہے واجب ہے فرض ہے، اسی طرح آئین کی عبارت میں بھی خود وضاحت موجود ہے۔ نصوص دین کے سلسلے میں ہم متن پر بہت زیادہ اصرار کرتے ہیں لیکن ہمیں اس کے مطلوب پر بھی نظر رکھنی چاہیے، اور یہی بات آئین کے فریم میں طے کردہ اصولوں کے ضمن میں دیکھنی چاہئے۔

ہمارا سب سے بڑا دینی فریضہ دعوت ہے۔ چاہے وہ عالم ہو یا غیر عالم، مسلمان اپنی کسی بھی حیثیت میں چاہے اس کا تعلق کسی بھی شعبے سے ہو بطور مسلمان اس کا سب سے اہم فریضہ دعوت ہے۔ خطبہ حجتہ الوداع میں حکم دیا گیا، ''بلغوا عنی ولوا آیۃ''۔ استعداد کو عذر بنا کر اس حکم سے پہلو تہی نہیں کر سکتے۔ میں کسی بھی حیثیت میں، چاہے میں عالم ہوں یا نہ ہوں، اس تقاضے سے پہلو تہی نہیں کر سکتا، چاہے ایک آیت ہی کا بیان اور ایک ہی نصیحت کیوں نہ دوسروں تک پہنچاؤں۔ البتہ بطور علماء آپ کا اس ضمن میں تقاضا اور ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ آپ اس مسئلے کو ایک داعی کی حیثیت سے ضرور دیکھیں کہ مذہبی آزادی کے ضمن بین المسالک جو رویے اور مسائل ہیں ان کو بھی لا اکراہ کے تناظر میں سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کریں۔ ہماری اپنی بہت بڑی غلطیوں اور رویوں کو وجہ سے نفاذ شریعت یا اسلام کا مسئلہ بھی لا اکراہ کی صورت میں دیکھا یا سمجھا جا رہا ہے جو کہ ایک بالکل مختلف صورت ہے۔ لوگ شریعت کے نفاذ کو جو مسلمانوں کے لئے ایک ضروری امر ہے جبر کا ایک تصور قرار دے رہیں ہے، جس کا الگ مفہوم ہے۔ یہ آپ کے سامنے ایک سوال ہے جس پر سب کو غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: اگر پاکستان میں اپنی مرضی سے مذہب اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہے تو دو سال قبل سندھ اسمبلی میں قرارداد پیش کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی ہندو اسلام قبول کرتا ہے تو اس کو چند دن الگ رکھ کر اسے غور و فکر کا موقع فراہم کیا جائے کہ کیا وہ واقعی بغیر کسی جبر کے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر رہا ہے، یہ قرارداد لانے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب:

یہ قرارداد اگرچہ قانون نہیں بن سکی، لیکن ہم اس سوال کو تھوڑا مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اور ریاست کے درمیان اعتبار کا رشتہ قائم نہیں ہو سکا۔ میں اپنے کئی غیر مسلم دوستوں سے جب اقلیتوں کے حقوق پر بات کرتا ہوں، ان میں عیسائی اور ہندو بھی ہیں، تو ان سے پوچھتا ہوں کہ ہمیں بطور اکثریت کون سے پورے حقوق مل رہے ہیں جو تم الگ اپنے حقوق کی بات کر رہے ہو، کیونکہ بطور شہری تو

ہم سب برابر ہیں۔نوکریوں کا مسئلہ ہے تو مسلمان اکثریت میں ہیں تو اکثریت میں بے روزگار ہیں، مسلمان غریب ہیں تو اکثریت میں غریب ہیں، اور معذرت کے ساتھ کہ مسلمان جاہل ہیں تو اکثریت میں جاہل ہیں۔ یہ جو اکثریت اور اقلیت کی تقسیم ہے اس میں امتیاز کا مسئلہ ہی نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ جو قانون موجود ہیں ان پر عملدرآمد ہی نہیں ہو رہا۔ ریاست کی نالائقی کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ شناخت کی بنیاد پر اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں وہ ریاست کی نالائقی ہے۔ اس معاملے میں ریاست کا نظریاتی طور پر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیونٹی کا یہ اعتراض ہے کہ جو بھی مذہب کی تبدیلی ہے وہ تبدیلی اپنی مرضی یا سوچ کے ساتھ نہیں ہوگی بلکہ یا تو اس میں جبر کا عنصر پایا جاتا ہے یا اسے کوئی ترغیب دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ہندو یا عیسائی سے مسلمان ہوتا ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ اس نے اپنے پورے عزم اور ارادے کے ساتھ ایسا کیا تھا جانچنے کے لئے ریاست کوئی نظم بنا دیتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ کسی کے ساتھ جبر کیا جائے یا اسے غور وفکر کا موقع نہ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہم نہ جبر چاہتے ہیں اور نہ ہی کسی کو کوئی لالچ دیکر مسلمان کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا شک وشبہ ریاست کے انتظام پر ہے نہ کہ قانون یا ایسے نظریہ یا تصور پر۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست غور وفکر کے لئے اس شخص کو جو موقع دے رہی ہے یا اس کا انتظام کر رہی ہے اس کے پیچھے اس کے کچھ اور مقاصد ہیں نہ کہ اصلاً اسے غور وفکر کا موقع دینے کے لئے ایسا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں اسلام کی تاریخ میں بھی فقہا کے ہاں ارتداد وغیرہ کے جو مسائل ملتے ہیں، ان کی اگرچہ مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں، لیکن ارتداد کی سزا دینے کے لئے ملزم کو صفائی، وضاحت اور قائل کر کے رجوع کرنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آپ کے پاس مسلمان ہونے کے لئے آتا ہے تو پہلے اسلام کی تمام جزئیات اور شرائط، اور اس کی قبولیت کے نتائج سے آگاہ کر کے اسے غور وفکر کا اچھی طرح موقع دے کر ہی اس کے اقرارِ اسلام کو قبول کر سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے بھی قبول بیعت سے پہلے شرائط اسلام کی وضاحت فرمائی اور قبولیت کے اقرار کے بعد داخلِ اسلام فرمایا۔ بیعت عقبیٰ اولیٰ اور بیعت عقبیٰ ثانیہ میں مدینہ کے قبائل کو قبولیت اسلام کے مثبت ومنفی نتائج سے اچھی طرح آگاہ کرنے کے بعد بیعت لی گی۔

ڈاکٹر عبدالغنی

چئیرمین شعبہ اسلامک سٹڈیز،ایف سی کالج لاہور

کائنات میں ہر شے کا ایک درجہ ہے۔ جیسے مادہ ہے یہ جب ترقی کرے گا تو نباتات کی شکل میں آئے گا یعنی پودوں کی صورت میں جیسے گھاس، درخت وغیرہ، سائنس کہتی ہے کہ ان میں زندگی اور نمو ہے۔ اس کے بعد مزید ترقی ہوتی ہے تو زندگی حیوانات کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ان میں شعور یا حس ہوتی ہے، مثلاً چڑیا جب گھونسلہ بناتی ہے تو اسے یہ شعور ہوتا ہے کہ وہ اپنا گھر بنا رہی ہے۔ ہر جانور میں کسی نہ کسی حد تک شعور ہوتا ہے اور ان میں بھی درجات ہیں۔ جو کام وہ کر رہے ہوتے ہیں اس کا شعور رکھتے ہیں، مگر اس کے انجام اور مقصد سے آگاہ نہیں ہوتے۔ جیسے گھوڑے کو یہ پتہ ہوتا ہے کہ میں دوڑ رہا ہوں، مگر اسے یہ پتہ نہیں کہ اس کی منزل کیا ہے۔ زندگی کا یہی وجود ترقی کر کے جب انسان کے درجے پر پہنچتا ہے تو اس میں آگہی آجاتی ہے اور تصور اور غور وفکر کی صلاحیت دکھائی دیتی ہے۔ دور تک سوچنے کی صلاحیت یا ویژن آجاتا ہے اور وہ وقت سے آگے دیکھتا اور سوچتا ہے۔ مجھے کچھ چیزیں حال میں نظر آرہی ہیں، افراد نظر آرہے ہیں مگر دیوار سے پرے نظر نہیں آرہا، باہر سڑک نہیں نظر آرہی لیکن تصور کی آنکھ سے انسان دور تک دیکھ سکتا ہے۔ یہ صلاحیت انسانی وجود کے ساتھ ہے جو جانور میں نہیں ہے۔ پھر انسان کے اندر ضمیر ہے جو نفس کی ایک کیفیت ہے جہاں کوئی رہنمائی کرنے والا نہ ہو وہاں انسان کا اپنا ضمیر اس کا رہنما ہے۔ جو اچھے اور برے میں امتیاز کرتا ہے۔ جیسے قرآن میں آیا ہے ''فالھمھا فجورھا وتقوٰھا''، کہ اس کے اندر نیکی اور برائی کی تمیز الھام کر دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے اندر ایک اور چیز ارادہ یا خواہش کی قوت رکھی گئی ہے۔ جیسے اگر آپ کو چائے یا پانی کی پیش کش کی جائے تو آپ اپنی مرضی کا انتخاب کریں گے یعنی آپ کے پاس اختیار کرنے کی آزادی ہے، یہ آپ کی اپنی خواہش یا مرضی ہے۔ ہم لمبی بحث میں نہیں پڑتے کہ ہم مجبور ہیں، مجبور محض ہیں یا خود مختار ہیں۔ مختصر یہ کہ کلی طور پر دیکھا جائے تو ہم 50% ارادے کے مالک اور آزاد ہیں اور کچھ امور رضائے الٰہی کے یا تقدیر سے وابستہ ہیں۔ اس طرح وہ چار بڑی صلاحیتیں ہیں جو انسان کو دی گئی ہی: آگہی، تصور کرنے کی صلاحیت، ممیز

اورارادہ، جو کہ ادنیٰ درجے کی مخلوقات میں نہیں ہیں۔ ہم یہ سمجھ لیں تو خود آ گاہی آ جاتی ہے۔

اب ہم مادہ، نباتات و جمادات اور حیوانات کو نظر انداز کر کے انسان پر بات کرتے ہیں۔ انسان چار چیزوں کا مجموعہ ہے: روح، جسم، دل، اور دماغ۔ پہلے جن چار عناصر آگ، ہوا، مٹی اور پانی کی بات کی جاتی تھی وہ سائنس نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ انسان کے چار اہم حصے دل، دماغ، روح اور جسم ہیں۔ میں نے صرف دماغ پر بات کرنی ہے کیونکہ میرا موضوع ہے 'مذہبی آزادی' لیکن اس سے پہلے میں غور وفکر کی آزادی پر بات کروں گا کہ کیا ہم اپنی سوچ میں آزاد ہیں؟ کیا انسان کی سوچ کو قابو کیا جا سکتا ہے؟ اس پر پابندی لگائی جا سکتی ہے؟ اس کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر اگر کسی سیاستدان کو جیل میں ڈال دیا گیا ہو تو گویا ان کے جسم کو قید کیا گیا ہے، ان کی سوچ کو قید نہیں کیا جا سکتا، وہ جیل میں بیٹھ کر سب کچھ سوچ سکتے ہیں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم کے کچھ حصے کو کنٹرول یا مانیٹر کیا جا سکتا ہے اور بہت سے حصے کو نہیں کیا جا سکتا۔ گویا نہ دماغ کو نہ دل کو اور نہ روح کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے بلکہ صرف جسم کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ دماغ کا کام سوچنا، غور وفکر کرنا، شعور و آگہی کی منازل کو عبور کرنا اور زاویہ ہائے نظر کو تشکیل دینا ہے، اپنے لئے ایک راستہ منتخب کرنا، اپنے لئے کسی مذہب کا انتخاب کرنا وغیرہ۔ میں اور آپ کیا یہ پابندی لگا سکتے ہیں کہ ہماری سوچ کا دھارا اس طرف نہیں جانا چاہئے اور اگر کوئی یہ کہے اگر ایسا سوچا یا نہ سوچا تو تمہاری سوچ کو قید کر دیا جائے گا۔ یہ کسی کے بس میں نہیں ہے۔

ہم سب مختلف انداز میں سوچتے ہیں، اپنی اپنی منشاء پر سوچتے ہیں، تو پھر ہمارے پاس کیا آپشن رہ جاتا ہے کہ کسی کی مختلف سوچ کو عزت دینا یا اسے کنٹرول کرنا، یہ تو سعی ءلا حاصل ہے کہ کسی کی سوچ کو کنٹرول کرنے کے لیے کوشش کی جائے۔ لہٰذا ایک دوسرے کی سوچ کا احترام کرنا ہی واحد حل ہے۔ آپ جو مرضی کر لیں دوسرے لوگوں کی سوچ کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ ہمارے بہت سے اسلاف ہیں جنہوں نے قید حالت میں جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر بڑا کام کیا ہے۔ اس حالت میں ان کی سوچ پر کوئی قدغن نہیں لگا سکا، بلکہ ایسی صورت حال میں دماغی صلاحیت زیادہ بیدار ہو جاتی ہے۔ انسانی جسم کا جوہر اس کے سوچنے کی صلاحیت اور گنجائش ہے جس کو کوئی قید میں ڈالنے یا جبر سے کنٹرول نہیں کر سکتا۔

جسم کی ضرورت آرام وطعام ہے۔جسم کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔شخصیت کا تیسرا جزو دل ہے۔دل سے مراد ہماری شخصیت کا وہ مرکز ہے جو نفسیاتی اور جذباتی پہلو رکھتا ہے۔دل کی خوراک باہم اچھے تعلقات ہیں۔اگر تعلقات خراب ہونگے تو بے چینی اور اضطراب پیدا ہوگا۔میاں بیوی کے مسئلے میں ایسا ہوتو اولاد پر اثر پڑتا ہے۔ہماری نفسیاتی وجذباتی شخصیت کا تقاضا ہے کہ محبت کی جائے یعنی باہم محبت واحترام ۔یہ میری شخصیت کی ضرورت اور نفسیاتی تقاضا ہے کہ لوگ مجھے احترام دیں اور میری تعریف کریں،اس سے ہم مطمئن رہتے ہیں۔لیکن اگر ہم اپنے لئے ایسا چاہتے ہیں تو دوسروں کی نفسیاتی ضرورت وتقاضے کا بھی خیال رکھتے ہوئے انہیں بھی محبت واحترام دیں۔

شخصیت کا چوتھا جز وروح ہے،روح کی خوراک ورثہ یا میراث ہے۔مولانا عبدالستار ایدھی کی ہم بات کریں تو ان کا ایک ورثہ ہے،صدقہ جاریہ،وراثت نہیں،یہ عبادت،خدمت یا ریاضت ہے۔دماغ کے لئے غوروفکر کرنا،غوروفکر سے راستے تلاش کرنا اس کی خوراک ہے۔سوچنے سے دماغ مزید تیز ہوتا ہے۔پہلے تو آپ اسے آزاد رکھیں لیکن ایک مقام پر پہنچ کر آپ اپنی سوچ وفکر کو منظّم کریں،تطہیر فکر کرنا لازم ہے۔جیسے جسم کی اگر ہم بات کریں تو اس کے عمل کی بھی حدود متعین ہیں،جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں،یعنی کہ جسم کی حدود مقرر ہیں۔گویا کہ اگر ہم اعضاء سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تو ہمیں اپنی فکر سوچ اور نظریے کی بھی ایسی حدود مقرر کرنا ہوں گی کہ ان سے کسی کا نقصان نہ ہو یعنی سوچ کو منظّم کرنا ہے۔دماغ کو سوچنے دیں،پھر اس کو تربیت سے ایک انداز میں لانے کی کوشش کریں کہ مثبت سوچ کیسے پیدا ہوگی جو دوسروں کے لئے فائدہ مند ہو۔انسانی سوچ کی آزادی میں بھی 180 ڈگری کی تبدیلی ممکن ہے۔پہلے انسان ایک ڈگر پر سوچتا ہے،مگر غوروفکر کے بعد اس کے خیالات میں مکمل تبدیلی آجاتی ہے۔صدیوں تک انسان ایک ڈگر پر سوچتا ہے،بعد میں نئی فکر آجاتی ہے جو انسان کو مکمل تبدیل کر دیتی ہے۔

مغرب میں 15 جون 1215ء تک ایک سوچ تھی،اس تاریخ کو انسان کی سوچ 180 ڈگری تبدیل ہوئی جو کہ ایک مکمل U-Turn تھا۔یہ تبدیلی میگنا کارٹا کے نام سے جانی جاتی ہے۔یہ ایک بڑا معاہدہ

ہے جو برطانیہ میں عوام کی طرف سے بادشاہ کی آمریت کے خلاف احتجاج کے نتیجے میں وجود میں آیا جس کے بعد امور مملکت میں عوام کی شراکت کو یقینی بنایا گیا۔ یہ آج سے 600 برس پہلے کا واقعہ ہے، اس سے پہلے آپ مزید 600 سال پیچھے چلے جائیں یعنی 615ء کے لگ بھگ جب قرآن حکیم میں رب تعالیٰ یہ حکم دیتے ہیں'' وامرھم شوریٰ بینھم'' کہ لوگوں کے معاملات باہم مشاورت سے طے کئے جائیں۔ اس جمہوری سوچ کا محرک اسلام ہے، جو کہ مغرب سے 600 سال پہلے یہ فکر عطا کر رہا ہے۔ میں اکثر یہ کہتا ہوں کہ اگر ہم تین چیزیں سیکھ لیں تو بڑی آسانی ہوتی ہے: ایک لفظ ASK ہے A سے مراد Attitude یعنی رویہ اور سوچ، S سے مراد Skills یعنی مہارت اور K سے مراد Knowledge یعنی علم وفہم ہے۔ علمائے کرام ہوں یا واعظین انہیں اپنی تربیتی نشستوں یا خطبات (Lectures) میں ان تینوں میں سے موقع محل کی مناسبت اور سامعین کی ضرورت کے اعتبار سے کسی ایک بات پر توجہ کرنا ہوتی ہے۔ مثلاً اس ورکشاپ کے اختتام پر کل آپ اپنے آپ کا تجزیہ کریں گے کہ A میں کیا سیکھا ہے، S اور K میں کیا سیکھ کر جا رہے ہیں۔ یعنی کہ رویئے میں کیا تبدیلی آئی ہے، مہارتیں کون کون سے بہتر ہوئی ہیں اور علم وفہم میں کیا اضافہ ہوا ہے۔ ہم بحیثیت ٹیچر بھی یہ سوچیں گے کہ ہم نے آپ کے لئے A میں بہتری کے لئے کیا بتانا ہے، S اور K میں اضافے کے لئے کیا کیا مواد، خیالات اور علم آپ تک منتقل کرنا ہے۔ سب سے مشکل کام A، اس سے آسان S اور اس سے بھی آسان K ہے۔ سب سے آسان کام معلومات کی منتقلی ہے۔ چند کتابوں اور ویب سائٹس کی نشاندہی آپ کے علوم میں اضافے کے لئے کافی ہیں۔

اسی طرح مہارتوں کے ضمن میں بھی سکھانا یا سمجھانا چنداں مشکل نہیں، لیکن سوچ میں تبدیلی یعنی رویوں کی تشکیل سب سے مشکل ہے۔ مگر اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعے آج سے 1400 سال پہلے بہت سی سوچیں تبدیل کر دی تھیں۔ جیسے آج ہم یہ سوچتے ہیں کہ جمہوریت شائد کوئی مغربی ایجنڈا ہے، لیکن اسلام نے پہلے سے نہ صرف شورائیت کا تصور دیا بلکہ لوگوں کی سوچ کو 180 ڈگری تبدیل کیا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری خطبہ اجتہاد میں فرمایا کہ میں اس دور کا سب سے بڑا مجدد اس شخص کو کہوں گا جو مغرب کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرے، جیسا کہ وہ 1948ء کے انسانی حقوق کے چارٹر کی بات کرتے ہیں۔ جبکہ خطبہ حجۃ الوداع اس

سے کہیں جامع اور مکمل ہے جو کہ 1400 سال پہلے انسان کو عطا کیا گیا۔لیکن ابھی مغرب اس پر اپنا حق جتا رہا ہے کہ گویا ان کا 1948ء کا چارٹر ہی انسانی حقوق کی پہلی دستاویز ہے۔ ہمارے اور مغرب کے درمیان روابط کا فقدان ہے۔ان کے خیالات ونظریات تو انگریزی زبان اور میڈیا کے ذریعہ ادھر پہنچ رہے ہیں لیکن ہماری طرف سے ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ہمارے مبلغین جو یہاں سے جاتے ہیں وہ بھی پاکستانی کمیونٹی سے بات کرنے کے بعد واپس آجاتے ہیں۔اس مواصلاتی خلا کی وجہ سے ہمارے سکالرز وہاں آکسفورڈ، ہارورڈ اور ایم آئی ٹی میں لیکچرز دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔علم تو ضرور ہے مگر زبان و بیان اور جدید تقاضوں سے عدم واقفیت کے مسائل ہیں۔

کاپرنیکس ایک پادری تھا جو سائنسی نظریات پر کام کرتا تھا، وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہماری زمین ساکت نہیں بلکہ یہ خود بھی حرکت کرتی ہے اور کسی اور کے گرد بھی گھوم رہی ہے۔اس نے اس پر مضمون لکھ کر شائع کی، کیونکہ چرچ کے نظریات اس کے برعکس تھے جس کے مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے اور زمین کائنات کا مرکز ہے۔ان کے مطابق زمین ساکن تھی۔گلیلیو اس بات کا مذاق اڑاتا تھا۔اس نے اس کو رد کیا اور کہا کہ میں نے دوربین سے دیکھا ہے کہ زمین ساکن نہیں اور نہ ہی کائنات کا مرکز ہے۔یہ ایک سیارہ ہے جو ہوا میں اڑتا پھرتا ہے۔ اس طرح سولہویں صدی میں پرانی سوچ میں اس سائنسی نکتہ نظر کی بدولت 180 ڈگری کی تبدیلی رونما ہوئی۔ مغرب نے اس کا ادراک دیر سے کیا ہے۔اب ہم اگر قرآن وسنت کا بغور مطالعہ کر کے وہ سائنسی حقائق سامنے لے کر آئیں جو ان کی سائنسی دریافتوں سے کہیں پہلے بیان کر دیئے گئے تھے تو واضح ہوگا کہ اسلام پہلے سے لوگوں کی سوچ میں ایک مثالی تبدیلی لا چکا ہے۔اسی لئے اقبال نے کہا کہ جو ان حقائق کو مغرب کے سامنے لے کر آئے گا وہ بڑا آدمی ہوگا، وہ جو مغرب کو بتائے گا کہ اسلام نے حقائق کی وضاحت کے لئے کتنا بڑا کام کیا ہے۔

جب اسلام یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ایک مکمل دین ہے، جو کائناتی حقائق کا بھی احاطہ کرتا ہے تو دعویٰ اس کے مخالفین کو چونکا دیتا ہے، کوئی اور مذہب یہ دعویٰ نہیں رکھتا۔ پھر اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اسلام کا یہ دعویٰ کیوں ہے، یہ برتری کیوں ہے، دوسرے مذاہب کیوں قابل قبول نہیں۔اسلام ایک مکمل دین کا نام ہے، اس کا مطلب ہے ماننا اور تسلیم کرنا ہے۔اس میں اگر مگر نہیں ہے۔ جو بھی اصول وعقائد اور حقائق بتائے گئے

ہیں ان پر ایمان لانا ہے جو کہ کامل ومکمل ہیں، اس بات پر ہمیں فخر ہونا چاہئے۔ مسلمان تنگ نظر یا گستاخ یا محدود سوچ کا حامل نہیں ہوسکتا۔ وہ دیگر انبیاء اور ان کی تعلیمات پر نکتہ چینی نہیں کرسکتا۔ وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے یہ بات کہتا ہے کہ جو تمہارے نبی ہیں وہ تم سے بڑھ کر ہمارے نبی ہیں۔ اسلام ہمیں دیگر مذاہب، انبیاء اور ان کی کتابوں کا بہت زیادہ احترام سکھاتا ہے۔ اگر ہم دعوت کا کام کریں گے تو دوسرے مذاہب پر تنقید کے بجائے ہم انہیں احترام کے ساتھ یہ کہیں گے کہ آئیں ہم آپ کو بہتر اور مکمل راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جیسا کہ کہا گیا ادعوا سبیل ربک بالحکمۃ۔ ایک مبلغ حکمت اور محبت سے کام لے گا۔

ایک پختہ صورتحال کو چیلنج کرنا اور اختلاف رائے رکھنا بھی ضروری ہے، لیکن اس کے لئے بھی محبت، اصلاح کا جذبہ اور حکمت نہایت ضروری ہے۔

اسلام میں مذہبی آزادی کا تصور

قرآن میں ایک آیت واضح ہے لا اکراہ فی الدین، کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔ ہم پیغام تو پہنچا سکتے ہیں لیکن جبر کے ساتھ کسی کو مسلمان نہیں کر سکتے۔ دوسری آیت سورہ یونس میں ہے کہ کیا تم زبردستی لوگوں کو ایمان کی طرف لاؤ گے، یعنی اللہ جبر نہیں چاہتے۔ اسی طرح تیسری آیت میں یہ فرمان ہوا کہ تم نافرمان اور مشرکین کو بھی گالی نہ دو، وہ تمہارے رب کو گالی دیں گے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ہمارا دین ہمیں احترام کا درس دیتا ہے۔ اسی طرح سورہ کہف میں ہے تم ان پر جبر نہیں کر سکتے۔ ان آیات سے یہ احکامات واضح ہوجاتے ہیں کہ ہم اسلام قبول کرنے کے لئے جبر نہیں کر سکتے۔ آپ کا منصب صرف پیغام پہنچا دینا ہے کیونکہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔ غیر مسلم خاص طور پر عیسائیوں کے ساتھ آپ کا حسن سلوک ضرب المثل ہے۔

جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے کسی بھی اسلامی ریاست میں دیگر مذاہب کے افراد کو اپنے دین پر عمل کی مکمل آزادی حاصل ہے بلکہ بعض مقامات پر انہیں اپنے دین کے ابلاغ کی بھی اجازت ہے۔ اسی طرح مکالمہ کی صورت میں ملکی یا بین الاقوامی سطح پر دیکھا جائے تو غیر مسلموں کو قرآن، اسلام یا سیرت طیبہ پر سوالیہ

اعتراض کی بھی اجازت دی گئی ہے تا کہ علماء کی سطح پر اس کا تسلی بخش جواب دیا جا سکے، مگر پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات یا قرآن کی تحقیر کی اجازت نہیں ہے۔ ایسا کرنا فتنہ پیدا کرتا ہے اور قابل مواخذہ ہے۔

اسی طرح ہر مسلک کو اپنے اپنے نظریات کی تبلیغ و تشریح کا بھی حق حاصل ہے مگر دوسرے مسالک، جیسے شیعہ سنی تنازعہ ہے، پر کھلم کھلا تنقید و تحقیر کا حق حاصل نہیں۔ یہاں مسئلہ یہ ہے لوگ اپنے مسلک کے بجائے دوسروں کے مسلک کی تشریح کرنا شروع کر دیتے ہیں جس سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے، جہاں سے فساد پیدا ہوتا ہے۔ دلیل کا جواب دلیل ہے نہ کہ فتنہ و فساد۔

پچھلے عرصہ میں ہمارے ملک میں مذہبی بیانیہ کے حوالے سے ایک بڑی بحث رہی ہے۔ اسلام امن ہے یا دہشت گرد؟ اسلام بزور بازو پھیلا ہے کہ دعوت کے ذریعہ؟ ایک مسلمان ریاست پاکستان کے آئین کے اندر اسلام کا بطور مذہب کیا کردار ہوگ؟ اس سلسلے میں تمام مکتب فکر کے علماء کی طرف سے ایک متفقہ بیانیہ پیش کیا گیا جس پر 1800 کے لگ بھگ علماء کے دستخط ہیں، یہ اہم پیش رفت ہے۔ یہ ہمارے لئے فخر کی بات ہے کہ بہت سے سیاستدانوں کے برعکس ہمارے تمام مکتب فکر کے علمائے کرام آئین کو زیادہ بہتر طور سے سمجھتے ہیں اور آئین کی تشکیل میں بھی ان کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ علمائے کرام ہمارے معاشرے میں بہتری لانے اور ملکی سطح پر یکجہتی پیدا کرنے کے لئے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں اب اس بیانیہ کا ابلاغ کرنا ہے۔

معاشرے میں ہم آہنگی کے لئے ہم نے عملی کاوش کرنی ہے، تقسیم در تقسیم کوئی حل نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے سیاستدان، میڈیا اور جماعتیں اور مذہبی گروہ اسی عمل کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں دلیل کے بجائے ایک دوسرے کی مذمت اور تذلیل کی جا رہی ہے۔ وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انسانی ظرف اور دماغ کے اندر بہت وسعت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہر مسئلے کا حل موجود ہے اس کے لئے وسعت نظر اور مثبت و تعمیری فکر کی ضرورت ہے۔

آئین پاکستان اور اسلامی تعلیمات

ڈاکٹر سید جعفر احمد

سابق چئیرمین پاکستان سٹڈی سینٹر جامعہ کراچی

میرا تدریس سے تعلق گذشتہ 35 سال پر محیط ہے۔ سیاسیات میرا مضمون ہے جس میں کیمبرج سے پی ایچ ڈی کرنے کا موقع ملا۔ مجھے ہائیر ایجوکیشن کمیشن، نیپا یعنی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ لاہور کے ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج اور 2002ء کے بعد قومی وصوبائی اسمبلیوں کے اراکین کی ورکشاپس میں سول سوسائٹی کی طرف سے لیکچرر اور مکالمہ کے لئے موقع ملتا رہا ہے۔ اب پارلیمنٹ نے ایک ادارہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پارلیمنٹری سروسز قائم کیا ہے وہاں پر بھی ورکشاپس کے لئے جانے کا موقع ملتا رہا ہے۔ آپ جیسے مذہبی شخصیات اور اداروں سے بھی بات چیت کا موقع میسر رہا ہے۔ اپنا یہ سارا پس منظر بیان کرنے کے بعد حرف آخر یہ ہے کہ میں ایک طالب علم ہوں اور بطور طالب علم سیکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی جہت موجود رہتی ہے اور مجھے ہمیشہ اس سے فائدہ ہوا۔ ہماری معلومات تحقیقی نوعیت کی اور کتابی ہوتی ہیں اور عملاً جو نظام چل رہا ہے اس کے حوالے سے ہمارے سامعین بالخصوص بیوروکریٹس وغیرہ کا تجربہ اور مشاہدہ زیادہ ہوتا ہے، اس لئے ان کے پروگراموں میں ان سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اسی جذبے کے ساتھ میں یہاں حاضر ہوا ہوں میرے سامنے جو لوگ بیٹھے ہیں ان کا تعلق مختلف مکتب فکر سے ہے اور مذہبی فکر اور معلومات رکھتے ہیں۔ مگر آج کے دور میں مذہب کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے ہم سب اس کی وجہ سے تشویش اور تذبذب کا شکار ہیں، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ لائنیں کہاں کھینچتی ہے؟ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟

انتہا پسندی جیسے ناجائز سمجھا جاتا ہے پر مبنی موقف رکھنے والے بھی مذہبی توجیہات کے اعتبار سے وہ سب کچھ جائز سمجھ رہے ہوتے ہیں جسے عرف عام میں ناجائز کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے تئیں اسلام پر چل رہے

ہوتے ہیں اور اس پر عمل کرنے پر زور دے رہے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ کیا انتہا پسندی کا لفظ پکڑ لیا ہے، انتہا پسندی تو اچھی چیز ہے۔ ہم اگر کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور اس عشق میں انتہا کا مظاہرہ نہیں کریں گے تو ہمارا عشق سچا نہیں مانا جائے گا۔ اگر تقویٰ اختیار کریں تو اس میں بھی انتہا کی ضرورت ہے۔ لیکن بعض اصطلاحات کے معانی اور مفاہیم زمانہ مقرر کرتا ہے، اور اس کی رو سے انتہا پسندی کو آج مثبت نہیں بلکہ منفی معنوں میں لیا جا رہا ہے۔ لہذا ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انتہا پسندی کیا ہے اور کیا اس کا تعلق ہمارے مذہبی بیانیہ سے ہے یا یہ حالات کی دین ہے اس کے اندر ریاضت کا کیا کردار ہے۔ میرے خیال کے مطابق پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی ہرگز نہ ہوتی اگر ریاست اپنے مقاصد کے لئے مذہب کا استعمال نہ کر رہی ہوتی۔ 70 سال یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے اور آج یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمیں اپنا بیانیہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ آٹھ سال تک ہم افغانستان میں ملوث رہے اور ہم یہ کہتے رہے کہ ہم جہاد کر رہے ہیں لیکن اگر ان آٹھ سالوں کے اخبارات اٹھا کر دیکھیں تو حکومت یہی کہتی رہی ہے کہ ہم افغان مجاہدین کی اخلاقی مدد کر رہے ہیں۔ بعد میں جب سوویت یونین وہاں سے نکل گیا تو ہمارے ہاں جہاد کے چمپئن سامنے آنے لگے اور یہ کہا جانے لگا کہ جلال آباد کے فاتح فلاں ہیں، کابل کی فتح کا سہرا فلاں کے سر ہے۔

ہمارے فوجی آفیسروں پر کتابیں لکھی گئیں، دعویٰ کیا گیا کہ روس کو وہاں سے ہم نے نکالا ہے۔ چند سال بعد اور کتابیں سامنے آئیں، تو پتہ چلا کہ سی آئی اے والے اسلام آباد بیٹھے ہوئے تھے اور تنظیموں کو اسلحہ کی تقسیم اور رہنمائی فراہم کر رہے تھے۔ اب تک جتنے حقائق سامنے آئے ہیں ان کے مطابق سی آئی اے کے ایجنٹ بھی یہ لکھ رہے ہیں کہ ان کے ضیاء الحق صاحب سے کتنے روابط تھے۔ یوں ریاست پاکستان ایک ایسے پروجیکٹ کا حصہ بنی جو ان کی دانست میں صحیح رہا، لیکن کہا یہ جاتا رہا کہ اخلاقی مدد ہو رہی ہے۔

2001-2002ء میں 11-9 کے واقعہ کے بعد ایک اور دور شروع ہو گیا۔ اس دور میں مستقل یہ کہا جاتا رہا کہ یہ صرف امریکہ کی جنگ نہیں بلکہ ہماری جنگ ہے۔ مگر ابھی آپ وزیراعظم صاحب کے حالیہ عرصہ کے بیانات کو دیکھیں تو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کسی دوسرے کی جنگ نہیں لڑیں گے، یعنی پہلے آپ دوسروں کی جنگ لڑتے رہے جو آپ کی جنگ نہیں تھی۔ ان سب کے نتیجے میں یہ ہوا کہ جیسے ایک بچہ اپنے پاؤں سے بڑا

جوتا پہننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ گر جاتا ہے، ہماری ریاست نے بھی اپنی گنجائش سے بڑھ کر بڑے بڑے محاذ کھول لئے۔ اگر وہ اپنے داخلی مسائل جیسے، غربت، بیماری اور بے روزگاری کو سنبھال لیتی تو وہ زیادہ مفید اور کارآمد تھا۔ ہم نے افغانستان میں مداخلت کی اور وہاں سے وسط ایشیاء کے راستے تلاش کرنے شروع کئے، اس کے لئے سٹریٹجیٹک ڈیپتھ (تزویراتی گہرائی) کی اصطلاح وضع کی گئی۔ اس وقت جب ہم سب مل بیٹھ کر مذہبی انتہا پسندی کے اسباب پر غور کر رہے ہیں تو اپنے کردار پر زیادہ پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس معذرت خواہانہ رویے کی ضرورت نہیں، ہم سے بھی غلطیاں ہوئی ہوں گی اور آپ سے بھی، لیکن ہمیں اس جگہ تک پہنچانے میں بنیادی کردار ہماری حکومتوں کا ہے۔ اگر آج ریاست یہ کہہ رہی ہے کہ وہ امن چاہتے ہیں اور اپنا بیانیہ بدلنا چاہتے ہیں تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ لیکن ہمیں بھی ذرا پھونک پھونک کر چلنا پڑے گا اور دیکھنا پڑے گا کہ کیا یہ محض لفاظی تو نہیں ہے۔

مجھے جو موضوع دیا گیا پاکستان کے آئین کے اندر اسلامی دفعات کا پس منظر کیا ہے۔ میں آئین کے ایک طالب علم کے طور پر چند ایک بنیادی باتیں آپ سے کروں گا۔ پاکستان آئینی اعتبار سے بہت سے بحرانوں سے گذرا ہے۔ ہمارے ایک مشہور آئینی مصنف جی ڈبلیو چوہدری، جو بنگلہ دیش سے تھے اور یحییٰ خان کے دور میں وفاقی وزیر بھی رہے، انہوں نے 63-1962ء میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے کہا کہ پاکستان آئینی طور پر ایک لیبارٹری کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ انہوں نے اس وقت کہا تھا جب ہم پہلے 9 سال 1935ء کے ایکٹ کے تحت چلتے رہے، پھر 1956ء کا آئین بنا، پھر 1962ء میں ایک اور آئین سامنے آیا۔ اس وقت تک 1973ء کا آئین نہیں بنا تھا، جس کے بعد سے اب تک یہاں تین مارشل لاء بھی لگ چکے ہیں۔ ان ادوار میں آئین کو بار بار تبدیل کیا گیا۔ اب تو زیادہ یقین سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ واقعی پاکستان آئین کی ایک لیبارٹری ہے۔ مسئلہ کیا ہے اس ضمن میں ہم دیکھیں تو اس میں ایک سماجی مسئلہ بھی ہے۔ آئین ایک کتاب ہے جس میں ہم اپنی بہترین صلاحیتوں، ادراک کے مطابق اپنی ریاست اور معاشرے کے مسائل کو سمجھتے ہوئے کچھ قوانین طے کرتے ہیں جو اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ایک تو آئین یعنی Constitution ہے اور ایک Constitutionalism یا آئینیت ہے۔

آئینیت ایک سماجی رویہ ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ سماج کی سطح پر ہم آئین کا احترام کرتے ہیں یا نہیں اور اس میں طے کردہ قوانین پر عمل کرتے ہیں یا نہیں، آئین ہمارے لئے کوئی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو ہمارے ہاں آئین و قانون ہونے کے باوجود جاگیردارانہ نظام یعنی Fuedalism بھی موجود ہے، اس کی جتنی قباحتیں ہیں وہ ہمارے ہاں موجود ہیں۔ ہمارے ہاں قبائلی نظام ہے اور اس سے وابستہ جتنی بھی سماجی قباحتیں ہیں وہ سب بھی معاشرے کا حصہ ہیں۔ ہمارے ہاں تفریق کا نظام موجود ہے، ہمارے ہاں شہری اور دیہاتی کا بھی بہت واضح فرق ہے۔ ہمارے ہاں امیر اور غریب کا بہت بڑا فرق ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جو بہت زیادہ تضادات کا شکار ہو وہاں آئینیت یا قانون کا کیا مقام ہوسکتا ہے۔ یہ آئین تو مثبت چیزیں طے کر رہا ہے کہ ہر شہری کو یہ بنیادی حقوق حاصل ہونگے اور امن وامان فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ کچھ چیزیں ممانعت کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں کہ یہ باتیں آپ نہیں کر سکتے یا آپ کے لئے ممنوع ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ معاشرے میں مثبت چیزوں کا اعتراف کتنا ہے اور جو ممانعتیں ہیں ان کو قبول نہ کرنے کا کتنا رجحان ہے۔ میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ آپ کراچی میں کسی سگنل کے پاس کھڑے ہو جائیں تو آپ مشاہدہ کریں گے کہ سگنل گرین سے ریڈ ہو جاتا ہے لیکن دوسری طرف سے آنے والی ٹریفک رکتی نہیں ہے۔ ایسے موقع پر میں گاڑی چلانے والوں کو دیکھ رہا ہوتا ہوں، ان میں سے 90% فیصد تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں جو بڑے دھڑلے سے سگنل توڑ رہے ہوتے ہیں، آپ انہیں کبھی درست نہیں کر سکتے۔ قانون کے ذریعے ان معاشرتی رویوں اور ان باتوں کا سدباب ہونا چاہئے۔

جہاں آئینیت اور قانون کا احترام ہے وہاں 98% فیصد لوگ قانون پر چل رہے ہیں اور اگر 2% نہیں چل رہے تو قانون ان کی گرفت کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں 98% فیصد لوگ قانون توڑ رہے ہوں تو آپ جتنی بھی اچھی انتظامیہ اور ریاستی مشینری لے کر آئیں تو بھی آپ انہیں قانون کے دائرے میں نہیں لا سکتے۔ یہ قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مجبوری ہے۔ آپ جتنے اچھے قوانین بنالیں اگر معاشرے میں ان کا احترام نہیں تو یہ سب رائیگاں جائے گا۔ قانون کا احترام، آئینیت اور احساس معاشرے میں کیسے پیدا ہوتا ہے کہ قانون کی پابندی کرنی چاہئے۔ اپنے ملک کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ گھروں سے لے کر

اجتماعی سطح پر اس کی تربیت اور شعور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ ان کی بیٹی نے انٹر کا امتحان دیا ہے، اگر یہ پتہ چل جائے کہ اس کے پیپرز کہاں گئے ہیں تا کہ ان میں اچھے نمبر لگوا کر میڈیکل میں داخلہ کروایا جا سکے۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ ایک تو بچی کو ساتھ لے کر آئے ہیں اور پہلی ملاقات میں ہی یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ دو دن کے بعد وہ بچی خود آئی اور کہنے لگی کہ ابو نے آپ سے بات کی تھی تو آپ نے اس سلسلے میں کیا کیا۔ میں نے اس سے معذرت کی کہ آپ کے ابو نے ایک غلط بات کی ہے اور اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ ہے کہ انہوں نے آپ کو اکیلے میں پھر یہاں بھیجا ہے۔ آپ ایک استاد سے یہ کہہ رہی ہیں کہ نمبر لگوا دیں۔ ہمارے ہاں گھروں میں قانون شکنی سکھائی جا رہی ہے۔ عام گفتگو کے اندر اس بات کو بڑائی سے بیان کیا جاتا ہے کہ ہم نے فلاں فلاں غلط کام ایسے ایسے کروالیا ہے۔ ہم مغرب پر دن رات تنقید کرتے ہیں، ضرور کرنی چاہئے، لیکن میں 6 سال برطانیہ میں رہا ہوں تو محسوس کیا ہے کہ وہ وہاں معاشرے کی اچھائیاں پرائمری کی سطح پر بچوں کو سکھائی جا رہی ہیں۔ ان کی اخلاقی تربیت بہت اچھے خطوط پر کی جاتی ہے۔ گویا آئینیت اور قانون کے احترام کا جذبہ بہت نچلی سطح پر سکھایا جا رہا ہے جس کی بدولت وہ معاشرے ابھی تک اعلیٰ اقدار برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

اس سے ہم پر یہ واضح ہوا کہ ہمیں قانون اور آئین پر بات کرنے سے زیادہ سماج کی سطح پر دیکھنا ہو گا۔ معاشرتی رویے کیا ہیں ان میں بہتری کیسے ممکن ہے۔ ہم اس آئین پر 4 گھنٹے تنقید کر سکتے ہیں اور 8 گھنٹے لگا کر اسے مزید بہتر بنا سکتے ہیں مگر معاشرہ ایسے ہی رہے گا۔ کیونکہ معاشرے کی اصلاح کے سوتے یہاں سے نہیں پھوٹ رہے، یہ سوتے گھروں یا نچلی سطح پر تربیت سے اور سکولوں سے پھوٹتے ہیں۔

پاکستان چونکہ ایک آئینی لیبارٹری رہی ہے۔ پاکستان جب بنا تو ہندوستان آزادی ایکٹ کے تحت یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں مملکتیں جب تک اپنا اپنا جداگانہ آئین نہیں بنا لیتے اس وقت تک 1935ء کا گورنمنٹ ایکٹ نافذ رہے گا۔ دونوں ممالک نے اسے عبوری آئین کے طور پر قبول کیا۔ ہندوستان نے 1950ء میں اپنا آئین بنا لیا۔ ہم نے 1956ء میں آئین بنایا، اس کے لئے ہمیں 9 سال لگے۔ اتنا عرصہ تک استعماری دور کا آئین ہمارے یہاں نافذ رہا، اس میں اقتدار اعلیٰ چونکہ بادشاہ یا ملکہ برطانیہ کے پاس تھا، یوں 9 سال تک ہمارا

اقتدار اعلیٰ تاج برطانیہ تھا۔ان 9 سالوں میں ہمارے 4 گورنر جنرل بنے، قائداعظم محمد علی جناح، خواجہ ناظم الدین، غلام محمد اور سکندر مرزا، ان چاروں کو گورنر جنرل بنانے کا فیصلہ داخلی طور پر ہوا۔ قائداعظم کو مسلم لیگ نے، جبکہ باقی تینوں کو مرکزی کابینہ نے نامزد کیا۔لیکن ان چاروں گورنر جنرلز کے تقرر کا اعلان برطانیہ کے بکنگھم پیلس سے ہوا، گویا ہم 9 سال تک مقتدر نہیں تھے۔

1956ء میں ہم نے آئین بنایا اس میں پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ رکھا گیا۔ ریپبلک یا جمہوری اس نظام یا ریاست کو کہتے ہیں جس میں مقتدر عوام ہوتے ہیں۔اس آئین کے نفاذ سے ہم نے اعلان کیا کہ اب تاج برطانیہ ہمارا اقتدار اعلیٰ نہیں رہا بلکہ پاکستان کے عوام ہیں، اور عوام کیسے یہ اقتدار استعمال کریں گے آئین میں اس کی تشریح کر دی گئی۔ یہ آئین دو سال اور چند ماہ تک نافذ العمل رہا کیونکہ آئین کے نفاذ کے نتیجے میں فروری 1959ء میں انتخابات ہونے تھے، لیکن فروری 1959ء سے چار ماہ قبل اکتوبر 1958ء میں ملک میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ جنرل ایوب خان مارشل لاء لگانے سے چند ماہ قبل امریکہ گئے اور امریکہ کی قیادت کو قائل کیا کہ اگر پاکستان میں انتخابات ہو گئے تو یہ امریکہ کے مفاد میں نہیں ہوگا، یہاں غیر مستحکم حکومت بنے گی اور پاکستان میں عدم استحکام خطے میں امریکی مفادات کے تحفظ اور روس اور چین کے گرد جو گھیرا تنگ کرنے کی پالیسی ہے اسے زک پہنچے گا۔ جنرل ایوب نے واپس آ کر مارشل لاء لگا دیا گیا اور بیس دن بعد سکندر مرزا کو بھی رخصت کر دیا، اس دوران امریکہ کا وزیر دفاع کراچی میں موجود تھا۔ایسے اقدامات میں امریکہ سے زیادہ ہمارے ان اداروں کی یہ دلچسپی رہی کہ امریکہ کو ملوث کیا جائے تا کہ ہمیں اس کی پشت پناہی اور طاقت ملے، ہماری معاشی و فوجی امداد جاری ہے تا کہ ہم ملک کے اندر اپنا تحکم قائم کریں۔

ہم نے 62-1960ء کے زمانے میں امریکہ کو پشاور میں بڈھ بیر کے مقام پر فوجی ہوائی اڈہ دیا، جہاں سے ایک جاسوسی طیارہ اڑا جس نے پورے سوویت یونین کے اوپر سے اڑ کر یورپ جانا تھا، وہ روس نے گرا دیا۔انہوں نے جب تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ پاکستان سے اڑا ہے۔ ہمارے ہاں آئین شکنی کی روایت رہی ہے۔ 1959ء میں انتخابات کا انتظار نہیں کیا گیا، مارشل لاء لگا دیا گیا۔ایوب خان نے 1962ء میں اپنا ایک آئین دیا وہ کسی قانون ساز اسمبلی نے نہیں بنایا۔ وہ آئین ایوب خان کی کابینہ کے چند وزیروں نے مل کر بنایا

تھا، وہ آئین پہلے نافذ ہوا، پھر اس کی روشنی میں انتخابات کے بعد تشکیل پانے والی اسمبلی میں منظوری کے لئے پیش کیا گیا۔ حزب اختلاف کے اراکین نے کہا کہ 1956ء کے آئین میں اس کا نام اسلامی جمہوریہ رکھا گیا تھا اب صرف جمہوریہ پاکستان رکھا گیا ہے، تو اسمبلی کو یہ بتایا گیا کہ یہ بھولے سے ہوا ہے۔ چنانچہ بھول کا تدارک کرتے ہوئے دوبارہ اسے اسلامی جمہوریہ کا نام دیا گیا۔ 1969ء میں ایوب خان نے خود آئین توڑا اور مارشل لاء لگایا۔ جنرل یحیٰ خان نے بڑے فخر سے کہا کہ اب ہم نیا آئین بنائیں گے اور نیا آئین بنانا پاکستان توڑنے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس موضوع پر میری ایک تحقیق بھی ہے، جس پر پھر کسی نشست میں بات کریں گے، اس میں میں نے لکھا ہے کہ یہاں دو مرتبہ آئین بنانے کی کوشش ہوئی اور دونوں مرتبہ ملک تقسیم ہوا۔

1947ء میں ہندوستان کی تقسیم ہوئی کیونکہ ہندوستان میں آئین نہیں تھا۔ 1935ء کا آئین صوبوں اور صوبائی حکومتوں سے متعلق تھا، مرکز کے لئے پورے ہندوستان کا کوئی آئین نہیں تھا۔ انگریز دور میں مرکز کے لئے آئین اور نظام نہیں بنایا گیا۔ 1946ء کے الیکشن اس لئے ہوئے تھے کہ مرکز کی سطح پر ایک آئین ساز اسمبلی بنے گی جو پورے ہندوستان کے لئے ایک آئین بنائے گی۔ ان الیکشن کے اندر مسلم لیگ نے پاکستان کے نام پر الیکشن لڑا اور جداگانہ انتخابات کے تحت پورے ہندوستان کی مسلم آبادی کی نشستیں مسلم لیگ نے بھاری اکثریت سے جیت لیں۔ لیکن اس متحدہ ہندوستان کی اسمبلی کا کوئی مشترکہ اجلاس نہیں ہو سکا۔ دو الگ الگ ملک بنے اور اسی اسمبلی کے منتخب ارکان نے الگ الگ ممالک میں الگ الگ اجلاس کئے۔ مسلم لیگ کے منتخب ارکان نے پاکستان کی نئی مملکت کی پارلیمنٹ کے ایوان سے کراچی میں اور باقی ماندہ منتخب ارکان نے دہلی میں نئی حکومت ہند کی پارلیمنٹ کا اجلاس کیا۔ متحدہ ہندوستان کا آئین نہیں بن سکا۔

دوسری مثال 1970ء کی اسمبلی ہے جس کے انتخابات اس بنیاد پر ہوئے کے پاکستان کا نیا آئین بنایا جائے گا جس کی پٹاری یحیٰ خان اور فوج نے کھولی اور ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فوجی حکومتیں پاکستان کی ہوں یا دیگر دنیا کی ان میں وہ سیاسی بصیرت نہیں ہوتی کہ معاملات کو تاریخ کے تناظر میں دیکھیں۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ 1970ء کے الیکشن سے پہلے عوامی لیگ بھی یہ کہہ رہی تھی کہ آئین میں یہ

یہ تبدیلیاں لائی جائیں، پیپلز پارٹی اور دیگر جماعتیں بھی آئین میں ترمیم کی بات کیا کرتی تھیں۔ نیا آئین بنانے کا مطالبہ ان سب کی طرف سے نہیں کیا گیا۔ الیکشن ہوئے تو پھر اس کے نتیجے میں متحدہ پاکستان کی نئی اسمبلی کا اجلاس منعقد نہیں ہو سکا۔ مشرقی پاکستان یعنی بنگال سے منتخب اراکین بنگلہ دیش کے نام سے نئی مملکت کی اسمبلی میں بیٹھے جبکہ مغربی پاکستان سے منتخب ہونے والے اراکین یہاں کے باقی ماندہ پاکستان کی پارلیمنٹ کا حصہ بنے۔ انہوں نے 1973ء میں سابقہ مغربی پاکستان اور موجودہ پاکستان کا آئین بنایا اور مشترکہ انتخابات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان یا بنگال سے منتخب ہونے والے اراکین نے موجودہ بنگلہ دیش کا آئین بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئین میں کتنی ہی خامیاں موجود ہوں اسے توڑ کر نیا آئین بنانے کی بات نہایت خطرناک ہے۔ ہماری تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آئین سازی کے نام پر دو مرتبہ ملک تقسیم ہوا۔

ہم اپنی آئینی تاریخ دیکھیں تو ہم گذشتہ ستر سال سے 4 بڑے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا طرز حکومت کیا ہوگا؟ شروع کے 9 سال سارے اختیارات کا مرکز گورنر جنرل رہے، پھر آئین بنایا اس کا نام ہم نے پارلیمانی رکھا، لیکن اس میں بھی صدر کے اختیارات بہت زیادہ تھے۔ آخری گورنر جنرل سکندر مرزا نے آئین سازی کے وقت یہ بات مدنظر رکھی کہ آئین کے نفاذ کے بعد گورنر جنرل کا عہدہ صدر کے عہدے میں تبدیل ہو جائے گا۔ لہذا جو اختیارات گورنر جنرل کے ہیں وہ صدر کو دے دینے چاہیں۔ جن وزیر اعظم کے زمانے میں یہ آئین بنا، چوہدری محمد علی صاحب وہ ایک بیوروکریٹ تھے، لہذا انہوں نے نئے آئین میں گورنر جنرل کو خوش رکھنے کے لئے صدر کو زیادہ اختیارات دینے پر سمجھوتہ کیا۔ 1962ء کا آئین ایک صدارتی آئین تھا، اس وقت چوہدری محمد علی، جو حزب اختلاف کے لیڈر بن چکے تھے، نے کہا کہ 1962ء کے آئین میں صدر کی وہی حیثیت ہے جو لائلپور میں وہاں کے گھنٹہ گھر کی ہے۔ جہاں ایک چوراہے میں ساری سڑکیں آ کر گھنٹہ گھر پر مل رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس راستے سے بھی آئیں گے، آگے صدر مملکت کھڑے ہوں گے۔

1973ء میں یہ طے کیا گیا کہ صدارتی نظام ہمارے موافق نہیں لہذا ایک پارلیمانی آئین تیار کر کے اسے نافذ کیا گیا۔ اس کے بعد ضیاء الحق صاحب نے آٹھویں ترمیم کے ذریعے سے یہ قدغن لگائی کہ

آپ اسے صدارتی نظام میں تبدیل کریں تو مارشل لاء ختم کروں گا ورنہ نہیں، اسمبلی نے مجبوراً آئین کو دوبارہ صدارتی بنا دیا۔ اس کے بعد بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دو دو مرتبہ اقتدار میں آئے اور صدر غلام اسحاق خان اور صدر فاروق لغاری کے ہاتھوں دو دو مرتبہ برطرف ہوئے۔ نواز شریف نے اپنے دوسرے دور حکومت میں دو تہائی اکثریت کے بل بوتے پر بے نظیر بھٹو کی تائید سے اسمبلی توڑنے کے صدارتی اختیار میں ترمیم کر کے اسے دوبارہ مکمل پارلیمانی بنا دیا۔ دو سال بعد مشرف صاحب آ گئے، انہوں نے 2002ء میں الیکشن کروانے کے بعد سترھویں ترمیم کے ذریعے صدر کے اختیارات میں اضافہ کر کے اسے دوبارہ صدارتی نظام میں تبدیل کر دیا۔ 2008ء میں جب وہ رخصت ہوئے تو پیپلز پارٹی نے اٹھارویں ترمیم کے ذریعے صدر کے اختیارات کو ختم کر دیا۔ اب پھر ملک کے اندر صدارتی نظام کی باتیں چل رہی ہیں اور جو لوگ اس کے حق میں بات کر رہے ہیں وہ یا تو اسٹیبلیشمنٹ ہے یا وہ ٹیکنو کریٹس ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس نظام کے اندر وہ انتخابات کے ذریعے داخل نہیں ہو سکتے، لہٰذا وہ صدارتی نظام کی حمایت کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک سائنسدان ہے، وہ اپنے شعبہ میں بہت ماہر ہوگا، مگر وہ تو صوبائی اسمبلی کا بھی الیکشن نہیں جیت سکتا، لیکن اگر صدارتی نظام ہوگا تو ٹیکنو کریٹس کے وزیر بننے کے امکانات پیدا ہوں گے۔ ان لوگوں کی چونکہ کوئی سیاسی بصیرت نہیں ہوتی اس لئے وہ پارلیمانی نظام کی خامیاں، سیاستدانوں کی نااہلی اور کرپشن کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ پارلیمانی نظام ختم کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک انگریز سیاسی مفکر الیگزینڈر پوپ کے ایک بہت اچھے جملے کا حوالہ دوں گا، انہوں نے کہا کہ For froms of Government let fools contest whatever is best administered is best. یعنی حکومت بنانے کے لئے بیوقوفوں کو مقابلہ کرنے دو، جو ان میں سے اچھا ہوگا وہی بہترین منتظم بھی ہے۔ اب چاہے وہ صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی نظام، سب انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہیں جن میں خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں، آج اگر خامیاں نہیں تو کل پیدا ہو جائیں گی۔ آج اگر آپ بہترین زیرو میٹر گاڑی لیکر آئیں تو چند سال بعد اس میں بھی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ نظام وہی بہتر ہوتا ہے جس میں اصلاح کی گنجائش موجود ہو۔ میں اپنے شاگردوں سے اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ اچھا سیاسی نظام ایک اچھی گاڑی کی طرح ہے کہ وہ گاڑی چل رہی ہے، کہیں اس نے خرابی کی آپ نے اسے سائیڈ پر کیا، کھولا، کچھ

تاریں وغیرہ ٹھیک کیں تو گاڑی پھر چل پڑے گی۔ اچھا سیاسی نظام اس گاڑی کی طرح ہے جس میں ٹول باکس موجود ہوتا کہ جہاں خرابی ہو وہ اس ٹول باکس کے ذریعے ٹھیک ہو جائے، نہ کہ خرابی ہونے کی صورت میں آپ گاڑی ہی بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔ صدارتی نظام ہو یا پارلیمانی دونوں میں خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ماحول اور معاشرے کی ساخت کیا ہے، مسائل کیا ہیں، ہمارے یہاں کون سا نظام بہتر طور پر چل سکتا ہے۔ جو بھی نظام ہم اختیار کریں گے، اس میں خامیاں موجود ہوں گی، کیونکہ انسانوں کا بنایا ہوا نظام ہے۔ لہذا جو بھی نظام اختیار کیا جائے اس کے اندر خرابیوں اور خامیوں کو دور کیا جائے، نہ کہ بار بار نظام بدلنے کی بات کی جائے۔ امریکہ میں صدارتی نظام جمہوریت ہے اور 230 سال سے چل رہا ہے۔ آج بھی ان کے نظام میں میں ایسی خامیاں اور خرابیاں موجود ہیں کہ لگتا نہیں کہ جمہوریت ہے۔ برطانیہ جسے پارلیمانی نظام کی ماں کہا جاتا ہے وہاں سب سے پرانا یعنی 500 سالہ پارلیمانی نظام ہے، اگر ان کی کمزوریوں کو دیکھیں تو حیرت ہوگی کہ کیا 500 سال کے سفر میں بھی وہ ان نقائص کو دور نہیں کر سکے۔ اس لیے سیاسی نظام میں خامیوں کے باوجود انہیں اختیار کرنا پڑتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ ہم اصلاح کے لامتناہی سلسلے کو قبول کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر پاکستان میں دوسرا بڑا مسئلہ نمائندگی کا بھی رہا ہے۔ ریاست کے اداروں کے اندر ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں کی نمائندگی کیسے ممکن ہوگی۔ اس مسئلے کو ہم 24 سال تک حل نہیں کر سکے۔ یہ اس وقت حل ہوا جب ہم نے مشرقی پاکستان کو دھکے دے کر الگ کیا۔ مشرقی پاکستان کی آبادی کل آبادی کا 54% فیصد تھی۔ باقی ماندہ پاکستان، سندھ، بلوچستان، پنجاب، خیبر پختونخواہ وغیرہ کی آبادی 46% فیصد تھی۔ بنگالی یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ہمیں مرکز میں اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے یعنی قومی اسمبلی، فوج، بیوروکریسی اسی طرح ملک کے جو وسائل ہیں ان میں آبادی کے تناسب سے ہمیں نمائندگی اور حصہ دیا جائے۔ 1971ء میں جب وہ الگ ہوئے تو اس کے بعد ہم نے آبادی کے اصول کو فوراً قبول کر لیا اور 1973ء کا آئین بنایا۔ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بھٹو صاحب کا اور اس دور کی اسمبلی کا بڑا کارنامہ ہے، کارنامہ تو تھا کہ آئین کی تشکیل ہوئی، لیکن یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ آبادی کی بنیاد پر نمائندگی نہ دینے اور وسائل کی تقسیم نہ کرنے کی پاداش میں ملک کو دولخت کرنے کے بعد بنایا گیا۔ بعد میں اسی

اصول کی بنیاد پر 1973ء کا آئین تیار کرنا پڑا۔

وسائل کی تقسیم کے لئے قومی مالیاتی کمیشن کا ادارہ ہے جو ہر پانچ سال کے بعد وسائل کی تقسیم کا جائزہ لیتا اور منظوری دیتا ہے، جسے قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ کہا جاتا ہے جو یہ طے کرتا ہے کہ صوبوں میں وسائل کی تقسیم کیسے ہوگی۔ اب تک جو سب سے اچھا ایوارڈ سمجھا جاتا ہے وہ ساتواں ایوارڈ ہے جو 2009ء میں ہوا، جس کے پانچ سال 2015ء میں پورے ہونے تھے، مگر 2019ء تک چار سال مزید گزر جانے کے باوجود ابھی تک نیا ایوارڈ وجود میں نہیں آیا۔ اب موجودہ حکومت آنے کے بعد نیا کمیشن تشکیل دیا ہے۔ دیکھیں اب وہ نیا ایوارڈ کس طرز پر تیار کرتے ہیں، یوں اختیارات اور نمائندگی دوسرا بڑا مسئلہ رہا ہے۔

پاکستان کا تیسرا آئینی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کو ایک وفاق ہونا چاہئے یا ایک صدارتی طرز مملکت، اگر وفاق ہو تو صوبوں کے کیا اختیارات ہونے چاہئے۔ 70 سال سے یہ جھگڑا چل رہا ہے۔ 1973ء کے آئین میں صوبوں کو جو حقوق و اختیارات دیئے گئے وہ ناکافی قرار دیئے گئے، چنانچہ 2010ء میں صوبوں کے اختیارات کافی حد تک بڑھائے گئے۔ میرا خیال ہے 1919ء میں انگریزی دور سے لے کر آج تک صوبوں کو اتنے اختیارات نہیں ملے، جیسے 2010ء کی اٹھارویں ترمیم کے ذریعے دیئے گئے ہیں۔ ان پر کتنا عملدرآمد ہوا یا عوام کی بہتری کے نکتہ نظر سے یہ کتنے مؤثر ثابت ہوئے ہیں یہ الگ بحث ہے لیکن کاغذی طور پر یا تحریری طور پر اس سے قبل اتنے اختیارات نہیں دیئے گئے۔

ہمارا چوتھا اور دیرینہ آئینی مسئلہ ریاست اور مذہب کے تعلق کے حوالے سے ہے، جس کے تناظر میں آج کی یہ ورکشاپ بھی منعقد ہوئی ہے۔ میں صرف اس کے آئینی پہلو پر بات کروں گا۔ پاکستان بننے سے پہلے نئی مملکت کا جو تصور پیش کیا گیا تھا اس کے اندر لوگوں کو یہ پیغام دیا جا رہا تھا کہ ایسا ملک بنے گا جہاں اسلام کے اصولوں کے مطابق نظام چلایا جائے گا۔ اور جو قیادت یہ بات کہہ رہی تھی اس کا اپنا رہن سہن اور طور طریق کسی بھی لحاظ سے خالص مذہبی پیرائیہ نہیں تھا۔ قائداعظم ہوں، لیاقت علی خان ہوں، سہروردی صاحب ہوں یا خواجہ ناظم الدین یا صوبوں کی قیادتیں، سندھ، پنجاب یا دیگر صوبوں کے رہنما ہوں۔ یہ سب مغربی طرز زندگی کے حامل تھے۔ یہ جب اسلام کی بات کر رہے ہوں تو زیادہ سے زیادہ ہم یہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس سے

مراد یہ ہے کہ جو اسلام کی مرکزی یا بنیادی اقدار ہیں، جس کا فہم مختلف درجوں میں کم وبیش تمام مسلمانوں کو ہوتا ہے، ان کی روشنی میں ریاست کا نظام چلایا جائے گا۔ اس کا ایک مقصد مسلمانوں کو بھی متحرک کرنا تھا۔ مسلمانوں کو نئی مملکت کی تحریک دلانے کے لئے یہ کہنا کافی تھا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگا۔ ایک عام آدمی کے ذہن میں اسلام اور اسلامی مملکت کا ایک تاریخی تناظر تھا، وہ اسی کے تحت نئی مملکت کے تصور کو اخذ کر رہا تھا۔ نہ کہنے والوں نے اس کی کوئی تشریح کی کہ آپ کا سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظام کیا ہوگا اور نہ ہی ان کے پیروکاروں نے اس کی تعبیر وتشریح ضروری سمجھی۔ جس کے ذہن میں جو بھی تعبیر اور نقشہ تھا، اسی تصور اور تناظر میں دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں آپ ﷺ کا دور یا خلفائے راشدین کے دور کا منظر تھا، اور کچھ تاریخ کے دیگر ادوار کے تناظر میں یہ تصور قائم کر رہے تھے۔

اب حال ہی میں ہندوستان کے ایک سکالر جو ہندو ہیں ان کی ایک بڑی ضخیم اور معنی خیز کتاب شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے کیمرج سے پی ایچ ڈی کی ہے کتاب کا عنوان ہے Creating Another State of Madina، ان کا کہنا ہے کہ اتر پردیش یعنی UP کے مسلمانوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل پاکستان بن جاتا ہے تو ہم بھی وہاں ہوں گے یا نہیں۔ کیونکہ اس وقت ہجرت کا کوئی تصور یا پلان سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ حالات کی خرابی کے نتیجے میں ایک بڑی ہجرت وقوع پذیر ہو گئی۔ وہ اس پوری تحریک کے اندر کیوں شامل تھے کیونکہ ان کا یہ تصور تھا کہ ایک نیا مدینہ وجود میں آ رہا ہے ہم وہاں رہیں یا نہ رہیں ہمیں اس کے قیام کے لئے اپنا کردار ادا کرنا ہے اور اپنا حصہ ضرور ڈالنا ہے۔ تو یہ ایک تصور تھا جس کے لئے ایک پوری تحریک چلی، نہ اس سیاسی اشرافیہ کو اتنا ادراک اور شعور تھا اور نہ ہی اس کے لئے کوئی تحقیق ہوئی کہ بیسویں صدی میں اگر ایک نئی مملکت بننے جا رہی ہے اور اسے ہم نے ایک جدید اسلامی ریاست بھی بنانا ہے تو آپ کا سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کیا ہوگا، آپ پرائیویٹیزیشن کتنی کریں گے، نیشنلائزیشن کتنی ہوگی، دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کا اسلوب کیا ہوگا۔ تعلیم کا نظام کیا ہوگا، مسلم لیگ کے اندر اس کے لئے کوئی تحقیق یا علمی کام نہیں کیا گیا۔ یہ ایک تحریک تھی جس میں نعرے، نظریات، اور تصورات تھے۔ لوگوں نے قیادت کی آواز پر لبیک کہا، ملک بن گیا تو حقیقی دنیا کے مسائل شروع ہو گئے۔

علماء کے اندر ایک ایسا طبقہ تھا جو کہتا تھا کہ ریاست کے اندر مذہبی طبقے کی بالادستی ہونی چاہئے، لیکن جو لوگ یعنی مسلم لیگ کی قیادت میں سے، اسمبلیوں میں بیٹھے ہوئے تھے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ہم نے تحریک چلائی اور پاکستان بنایا ہے اسے کیا ہم مولویوں کے سپرد کر دیں گے پھر ہم کہاں جائیں گے۔ اسی ضمن میں مشہور زمانہ قرارداد مقاصد اسمبلی میں پاس ہوئی۔ اس کے مدون نے الفاظ کو اس طرح سے استعمال کیا ہے کہ تم بھی خوش ہو جاؤ، یہ بھی خوش ہو جائیں۔ طبقہ علماء کو متاثر کرنے کے لئے انہوں نے اس میں یہ تحریر کیا کہ پوری دنیا میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اس کے اقتدار اعلیٰ کا استعمال پاکستان کے شہریوں کے ذریعے بطور نیابت ہوگا تو لبرل طبقہ بھی مطمئن ہو گیا۔ یہ قرارداد ایک سمجھوتہ کے فارمولہ کے تحت منظور کی گئی۔ 1949ء کی اسمبلی کی اگر بحث کو دیکھیں تو آپ حیران ہونگے کہ لبرل طبقہ جو آج تک اس قرارداد کی مخالفت کرتا چلا آرہا ہے کہ اس کی وجہ سے سارا ابہام اور خرابی پیدا ہوئی ہے، ان لوگوں نے بھی اس قرارداد کی حمایت کی تھی۔ اس طبقہ کے ایک بڑے لیڈر میاں افتخار الدین اسمبلی میں تھے انہوں نے بھی اسمبلی میں اس کی حمایت کی، مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی جگہ خوش تھے۔ چنانچہ 1956ء کے آئین میں اس قرارداد کو Pre-amble یعنی بطور ابتدائیہ آئین کا حصہ بنایا گیا، 1962ء اور 1973ء کے آئین میں بھی اسے Pre-amble بنایا گیا ہے۔

مسئلہ تب پیدا ہوا جب ضیاء الحق صاحب نے آٹھویں ترمیم کروائی تو انہوں نے اسی ترمیم میں یہ بات بھی شامل کی یہ Preamble یا ابتدائیہ اب آئین کا عملی جزو یا عملی حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آئین کا حصہ بن گیا ہے۔ جب آئین کی تشریح ہو یا آپ کوئی مقدمہ لیکر عدالت میں جائیں تو آپ یہ دعویٰ کریں کہ اس آرٹیکل کی روشنی میں آپ فلاں فلاں حقوق کے حقدار ہیں۔ عملی حصہ بننے کے بعد ایک اور بحث شروع ہوگئی، اور اس بات کی تشریح کی ضرورت پڑ گئی کہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کے اختیارات کون استعمال کر سکتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ جن میں چور، بدمعاش اور کرپٹ لوگ ہیں وہی احکامات ربانی کی تشریح اور نفاذ کریں گے۔ یہ اگر طبقہ علماء کا حق ہے تو پھر عوامی نمائندگی کے معنی کیا ہیں۔ 1973ء کا آئین بنانے والوں میں اکثریت تو لبرل لوگوں کی تھی چاہے وہ بھٹو صاحب ہوں یا ولی خان وغیرہ لیکن اس وقت بھٹو صاحب کا واحد خدشہ یہی تھا کہ آئین بن جائے اور دوسرا ان کی خواہش تھی کہ یہ آئین متفقہ ہو، حالانکہ اسمبلی

میں ان کے پاس اتنی اکثریت تھی کہ وہ اپنے طور پر آئین تیار کر کے منظور کروا سکتے تھے۔ چونکہ بھٹو صاحب پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے مجیب الرحمٰن کی اکثریت کو تسلیم نہیں کیا، وہ اس داغ کو دھونا چاہتے تھے۔ انہوں نے حزب اختلاف کو، چاہے وہ محض دو یا تین سیٹیں لینے والی پارٹیاں ہی کیوں نہ ہوں، انہیں آئین پر اتفاق رائے کے لئے آمادہ کیا۔ متفقہ آئین بھٹو کی ایک بڑی تاریخی ضرورت بن چکا تھا اس کے لئے انہیں بڑی سطح پر سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اس وقت مذہبی جماعتیں، جن میں دو یا تین جماعت اسلامی، 5 سے 7 تک جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام کے الگ الگ اراکین شامل تھے، انہوں نے بھرپور دباؤ کے ذریعے آئین کے اندر کافی ایسی باتیں شامل کروالیں جو ان کے لئے اطمینان کا باعث ہوئیں۔ ان سب نے بعد ازاں یہ دعویٰ کیا کہ اب پاکستان کا آئین اسلامی بن چکا ہے۔

کچھ خاص خاص باتیں مثال کے طور پر اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا، دنیا میں شاذ و نادر ہی کسی مملکت کا کوئی مذہب مقرر کیا گیا ہو، اس پر یہ بحث بھی ہوئی کہ مذہب تو انسانوں کا ہوتا ہے آیا ریاست کا بھی کوئی مذہب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ایسی صورت میں اقلیتیں کیسے ریاست کے اندر اپنی ذمہ داری یا اس کے ساتھ اپنی وفاداری کا تعین کریں گی۔ لیکن بہرحال یہ آپ کے آئین میں درج ہے۔ اس شق سے ہمارا مذہبی طبقہ بڑا مطمئن تھا۔ پھر صدر مملکت مسلمان ہوگا، اس میں اسمبلی کے رکن بننے کی اہلیت ہونی چاہئے۔ وزیراعظم کے لئے جو حلف کی عبارت رکھی گئی وہ صرف ایک مسلمان ہی کے لئے تحریر ہو سکتی ہے یعنی وہ حلف بھی صرف مسلمان ہی اٹھا سکتا ہے۔ یہ مذہبی طبقے کے لئے بڑے اطمینان کی بات تھی۔

پھر آئین میں ایک بڑا باب پالیسی کے اصول کا ہے جس میں وہ چند شقیں درج کی گئی ہیں کہ اسلامی اقدار کا فروغ اور اقلیتوں کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری قرار پائی ہے۔ آپ اسلام کے فروغ کے لئے، نظام اسلام کے قیام کے لئے اپنا کردار ادا کریں لیکن اس سے اقلیتوں کے حقوق پر اثر نہ پڑے اور اقلیتیں بھی اس ملک کے شہری طور پر ایسے کاموں سے اجتناب کریں جن سے اسلامی اقدار متاثر ہوں۔ آئین میں پالیسی کے اصول بھی صحیح طور پر علماء کے حق میں ہیں۔

بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے ایک پورا باب ہے جو آرٹیکل 8 سے 28 تک 21 نکات پر

مشتمل ہے جس میں ہر شہری کے بنیادی حقوق، تعلیم، اظہار رائے، بنیادی سہولتوں کی فراہمی، اظہار اجتماع اور تنظیم سازی کے حقوق کا تحفظ دیا گیا ہے، اپنے اپنے مذہب پر چلنے اور اس کی تشریح و تبلیغ کا حق بھی دیا گیا ہے لیکن یہ اس حد تک ہے کہ اس کا دائرہ آپ کے اپنے مذہب تک ہو، آپ دوسروں کو اپنا مذہب اختیار کرنے کے لئے جبراً آمادہ نہیں کر سکتے۔

سب سے اہم بات اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے ایک ادارہ تشکیل دیا گیا ہے جو اسلامی قانون سازی کے لئے رہنمائی کی فراہمی کا کام کرتا ہے۔ یہ اسی ابہام کے ازالہ کے لئے بنایا گیا ہے جس کا پہلے ذکر کیا گیا کہ اسلامی احکامات و نظام کا نفاذ لبرل سیاسی لوگ اور پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے طرح طرح کے لوگ کریں گے یا کہ یہ طبقہ علماء کی ذمہ داری ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے 20 ارکان ہوتے ہیں اور صدر ان کا تقرر کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ فیصلہ وزیراعظم کی ہدایت و مشاورت کی بناء پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ضیاء الحق صاحب اور مشرف کے دور صدارت میں یہ اختیار کلیتاً صدر کو منتقل کیا گیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے اختیارات اور کردار بڑا اہم ہے۔ ان کا یہ کام ہے کہ قومی پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیاں جو بھی قانون سازی کرتی ہیں اس کے لئے وہ رہنمائی کرے گی کہ یہ قانون اسلامی تعلیمات کے مطابق درست ہے یا نہیں، اگر اس سے متصادم ہے تو فوری طور پر اس کے خاتمے اور معطّلی کے لئے نیا بل سامنے لایا جائے گا۔ اس کے علاوہ ماضی میں جو قوانین بن چکے ہیں ان کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل میں تمام اسلامی مسالک کے نمائندے شامل ہوں گے جو اپنے مسلک سے متعلق امور میں رہنمائی کر سکتے ہیں۔

یہ ساری قانونی و آئینی صورت حال ہے۔ آئین میں اسلامی دفعات یا قانون سازی کا عمل اپنی جگہ بہت عمدہ اور اعلیٰ ہے، لیکن مسئلہ وہی ہے جس کی نشاندہی شروع میں کی گئی کہ قوانین تو موجود ہیں مگر ان پر عملدرآمد کے لئے قانون کا جو احترام اور جس آئینیت کی بطور سماجی رویوں کے ہمیں ضرورت ہے وہ مفقود ہے۔ محض دفعات یا قوانین پاکستان کو مثالی اسلامی معاشرہ نہیں بنا سکتے۔ صحیح معنوں میں وہ معاشرہ جس کا خواب ہم دیکھتے رہے ہیں وہ اسی صورت میں وجود میں آ سکتا ہے جب ہم تعلیم کے بنیادی نظام سے لیکر میڈیا تک اخلاقی تربیت کا ماحول اختیار کریں۔ یہ بنیادی باتیں جن کا آپ نے اپنی اپنی سطح پر خیال رکھنا ہے اور

افراداور معاشرے کی تربیت کرنی ہے۔

آپ یہ نہ کہیں کہ لوگ آپ کے پاس چل کر ہدایت، رہنمائی اور تربیت حاصل کرنے کے لئے آئیں بلکہ آپ ان کے پاس جائیں۔ انہیں ان کے اعمال اور حرکتوں کی وجہ سے اپنے آپ سے دور نہ کریں، بلکہ ان کے قریب رہ کر، انہیں قریب رکھ کر، انبیاء اور اولیاء کی سنت اور طریقے کے مطابق کردار کا عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے پیار اور محبت سے ان میں تبدیلی لائیں۔ اولیائے کرام نے لوگوں سے نفرت نہیں کی اور نہ نفرت بانٹی ہے بلکہ اپنے اچھے عمل، کردار اور حسن اخلاق سے لوگوں کو متاثر کیا اور محبت سے ان کے قریب رہ کر ان کی خامیوں، برائیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کر کے لوگوں کی اخلاقی تربیت کی۔ ہمارے اولیائے کرام جیسے حضرت داتا گنج بخشؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان جیسے دوسرے اولیائے کرام نے معاشرے اور لوگوں پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے۔ ان ہستیوں نے نہ صرف معاشروں بلکہ ممالک اور اقوام کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ یہ ان لوگوں کے قریب رہنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے جن سے بدبو آتی ہے اور کبھی دوسروں کو یہ بھی نہیں کہا کہ تم برے لوگ ہو یا تمہارے اندر یہ کوتاہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر تمام مذاہب کے مرد و عورت، ہندو و مسیحی تمام حاضری کے لئے آرہے تھے۔ فراک پہنے ہوئے سنٹرل ایشیاء کی کرسچین خواتین بھی وہاں موجود تھیں۔

آپ مصلح کا کردار ادا کریں لیکن خود کو پارسا سمجھ کر اور گنہ گار کو گنہ گار کہہ کر اصلاح کریں گے تو کبھی بھی اصلاح نہیں ہوگی۔ لوگوں کے اندر غیر محسوس طریقے سے تبدیلی لانے کی کوشش کریں۔ بہتر اسلامی معاشرہ تب ہی بنے گا جب ہم بہتر انسان تیار کریں گے۔ برطانیہ اور دیگر مغرب میں تین الفاظ ہیں جنہیں وہ میجک ورڈز یعنی جادوئی الفاظ کہتے ہیں: Please, Sorry, Thank you جس معاشرے میں یہ تین الفاظ آجائیں تو بڑی حد تک وہاں بہتری آجائے گی، آپ ان الفاظ کا وہاں پر عام استعمال دیکھیں گے۔ ہمارے معاشرے میں اس کے برعکس ہے اور ہر وقت ایک جارحانہ انداز ہوتا ہے۔ روزمرہ کے معاملات میں ہم کیسے ایک دوسرے کے ساتھ معاملات اور گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، آپ اس کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ دوسرے ہم نرگسیت کا شکار ہیں، ہم اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں، اپنی اپنی اناؤں کا شکار ہیں۔

ہمارے ہاں انانیت اور نرگسیت بہت زیادہ ہے۔ کہ میں نے یہ کیا، میں یہ کہتا ہوں، بات ایسی نہیں بلکہ ایسے ہے جیسا میں کہہ رہا ہوں، ہم اکثر نہیں کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر یورپ میں کسی سے راستے کا پوچھیں تو وہ کہے گا کہ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو یوں جاتا پھر یوں مڑتا اور اس طرف جاتا، جبکہ ہم اکثر حکم کے انداز میں کسی کو سمجھا رہے ہوتے ہیں، گویا کہ یورپ میں فرد نے راستہ بتانے میں بھی آپ کو حقیر نہیں سمجھا، یعنی راہ ہدایت بتا کر بھی فیصلہ اسی پر چھوڑیں، یہی ہمارے اولیاء اور صوفیائے کرام کا راستہ ہے جو میں نے فرانس اور یورپ میں دیکھا۔

سوال: کسی ریاست کا مذہب کیوں نہیں ہوسکتا؟

جواب:

دنیا میں اگر کسی ریاست کا مذہب نہیں متعین کیا گیا تو میرا اپنا خیال ہے کہ عملاً اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر پاکستان کے ریاستی مذہب کا تعین کیا گیا ہے تو اس کی اپنی توجیحات ہیں۔ لیکن میرے نزدیک اگر میری کوئی کار ہے یا میں یہ کہوں کہ میں یہ جو میز استعمال کرتا ہوں اس کا کوئی مذہب ہے، اسی طرح اگر پاکستان کے حوالے سے آپ کو یہ کہنا اچھا لگتا ہے تو ٹھیک ہے آپ یہ کہہ کر خوش ہو جائیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑھتا۔ مذہب افراد اور معاشروں کا ہوتا ہے۔ مذہبی قدریں ہم معاشرے کے اندر دیکھتے ہیں۔

میں ریاست کے موضوع پر مزید نہیں بات کرنا چاہتا، یہ ایک طویل موضوع ہے۔ ہمارا سماجی علوم کے دانشوروں کا ایک پورا مکتب فکر ہے جن کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں بہت سارے ایسے انبیاء کا ذکر ہے جنہوں نے ریاست سازی نہیں کی اور نہ وہ حکمران تھے، مگر ایسے انبیاء بھی تھے جنہوں نے ریاست وحکومت قائم کی جیسا کہ آپ ﷺ کا مدنی دور ہے۔ اسی طرح آج کے دور میں یہ دیکھا جا رہا ہے کہ آج کی ریاست میں مذہبی، انسانی یا اخلاقی اقدار کا خیال رکھا جاتا ہے یا نہیں، نہ کہ اس کا نام مذہب کے حوالے سے رکھا گیا ہے یا نہیں۔

اسلام کی آفاقیت یہ ہے کہ وہ ہر جگہ مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے، مسلمان چاہے اکثریتی مسلمان ملک میں رہتے ہوں یا دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے ملک میں قیام پذیر ہو، ان کے لئے اسلامی تعلیمات میں زندگی گزارنے کے لئے مکمل رہنمائی موجود ہے۔ اسلام جاپان یا امریکہ میں رہنے سے ساقط نہیں ہوتا، یہ اس کی عالمگیریت ہے۔ اب آپ نے اس عالمگیریت کو اس کی مقبولیت کے مطابق بروئے کار

لانا ہے۔آپ ایک جمہوری نظام میں، چاہے وہ صدارتی یا پارلیمانی طرز حکومت ہے یا کوئی اور نظام ہے، اسلام کے آفاقی اصولوں کی روشنی میں اپنے لئے، ریاست کے لئے اور معاشرے کے لئے قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔اگر قائداعظم محمد علی جناح نے قرآن کو اپنا آئین قرار دیا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ جو بھی نظام مملکت وحکومت ہم طے کریں گے اس میں قرآن کی تعلیمات واصول بنیادی کردار واہمیت کے حامل ہوں گے۔اسی طرح جب قائداعظم سے قیام پاکستان سے پہلے نئے ملک میں طرز حکومت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ فیصلہ پارلیمان نے کرنا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارا آئین کینیڈا اور آسٹریلیا کی طرح وفاقی طرز کا ہوگا، یعنی بنیادی اصول تو اسلام اور قرآن ہے لیکن جزئیات اور تفصیلات کسی بھی دنیاوی نظام سے لے سکتے ہیں۔

ہم ایک مرتبہ افریقہ ایک کانفرنس میں گئے تو وہاں کینیا کی سیکرٹری خارجہ نے ایک حیران کن بات بتائی جو امریکہ میں بھی نہیں تھی، یعنی امریکہ اور کینیا کی سینٹ میں تمام صوبوں کی برابر نمائندگی ہوتی ہے لیکن کینیا میں خواتین کی نمائندگی مردوں کے مساوی ہے جو دنیا کے کسی ملک میں بھی نہیں۔یہ ان کی اختراع ہے تو اپنی ضروریات کے مطابق کوئی اور ملک بھی اس کو اپنا سکتا ہے۔

سوال: پاکستان میں اقلیتوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ دنیا میں کہیں بھی نہیں، لیکن پھر بھی اقلیتیں خوش نہیں ہیں۔

جواب:

میں اس سے مؤدبانہ اختلاف کروں گا، ہمارے یہاں سندھ میں ہندو آبادی کے ساتھ ہمارے سماجی رویوں اور قوانین کے اطلاق میں امتیاز نظر آتا ہے۔ہندوستان میں اگرچہ صورت حال ہم سے بھی بہت خراب ہے لیکن یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کو بڑی حد تک سہولتیں اور آزادی حاصل ہے حتیٰ کہ مدارس کو بھی امداد دی جاتی ہے، میلاد کے جلوس اور عاشورہ کی اجازت ہے۔امریکہ کی ایک جیل میں امام مقرر کئے گئے جو قیدیوں کو جمعہ پڑھانے کے لئے آئے۔برطانیہ اور امریکہ کی پارلیمان میں مسلمان ہیں، صرف فرانس میں حجاب کے حوالے سے سخت مؤقف اختیار کیا گیا مگر باقی مغربی ممالک میں مجموعی طور پر اچھا رویہ ہے۔

طاہر حمید تنولی

ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی لاہور

پاکستان کے قیام کی اساس چونکہ اسلام ہے لہذا نفاذ اسلام کے موضوع پر شروع سے بحث و مباحث ہوتے رہے ہیں اور ہونے بھی چاہیئں۔ یہ قوم کے ہر ہر فرد، اہل علم و دین اور عوام کی اکثریت کی بنیادی آرزو رہی ہے کہ جس بھی دستور و آئین کا یہاں نفاذ ہو اس کا حاصل و مقصود نفاذ اسلام ہونا چاہئے۔ آپ جس ماحول میں رہ رہے ہیں تو اسی کے تناظر میں مباحث کی اپنی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔ آپ چونکہ طبقہء علماء سے ہیں اور مدارس سے وابستہ ہیں، اس لئے آپ کے ہاں یہ بحث زیادہ رہی ہے۔ جب ہم یہ بات کرتے ہیں کہ کیا پاکستان کا دستور اسلامی ہے تو اس میں تین سوالات مضمر ہیں جن کا ہم جواب تلاش کر رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ چونکہ یہ ملک اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے لہذا یہاں پر دستور اسلامی ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ یہ دستور اسلامی نہیں ہے لہذا اس کو ختم کر کے یہاں اسلامی دستور لانا چاہیے، یعنی کہ نیا نظام لانا چاہیے جس کی بنیاد پر یہ ملک وجود میں آیا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ جو بھی اس دستور میں میسر ہے اس کو سامنے رکھ کر ہمیں اس کو بنیاد بنا کر مثالی اسلامی معاشرہ بنانا ہے۔ ان میں سے ایک مثبت اپروچ ہے اور ایک منفی اپروچ، منفی اپروچ کے ساتھ تو ہم بہت سے راستے خود بند کر دیتے ہیں، لیکن مثبت اپروچ کے ساتھ بہت سارے راستے کھل جاتے ہیں، اور آپ موجود مصالح اور مواد کو لیکر بہت بڑی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں جس کی صدیوں سے ملت اسلامیہ خواب دیکھتی چلی آ رہی ہے۔

پس منظر میں دیکھیں تو یہ آئین حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آیا۔ آئینی ڈھانچے اور مزاج کے اسلامی ہونے کو سمجھنے کے لئے ہمیں پورا پس منظر دیکھنا ہوگا۔ جب پاکستان بن رہا تھا تو بانیانِ پاکستان کا نکتہء نظر یہ تھا کہ یہ ملک اسلامی اقدار کا آئینہ دار ہوگا اور نہ صرف اسلام کے نظام کا نفاذ ہوگا بلکہ دنیا بھر کے لئے نظام اسلام پر ایک عملی نمونہ ثابت ہوگا۔ اس طرح کے ارادے اور ہدف اس ملک کے بانیان کی طرف سے پہلے دن ہی سے طے کر لیے گئے تھے۔ اس لیے ابتداء ہی میں علماء کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے ذمہ یہ کام تھا

کہ وہ رہنمائی کریں کہ اس ملک کا نظام کن خطوط پر استوار کیا جائے گا۔ گویا یہ سنگ میل نصب کر دیئے گئے تھے جن پر آئین کی شاہراہ تعمیر کی گئی۔ وہ سنگ میل پہلی دستور ساز اسمبلی کی طرف سے منظور کردہ قرارداد مقاصد ہے۔

جس وقت تحریک پاکستان جاری تھی اور قائداعظم نے مسلم لیگ کو سنبھالا اور منظّم کیا تو پورے ہندوستان کے نمایاں مسلمان رہنماؤں کو اپنے ساتھ شامل کیا۔ پنجاب میں علامہ محمد اقبالؒ تھے، انہیں پنجاب مسلم لیگ کا صدر بنایا۔ اس سے پہلے وہ مرکزی مسلم لیگ کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ 37-1936ء میں علامہ اقبال نے جو خطوط قائداعظم کو لکھے ان کی بدولت قائداعظم اس بات کے لئے قائل ہو گئے کہ الگ وطن کا قیام مسلمانوں کی ناگزیر ضرورت بن چکا ہے۔ جب قائداعظم نے علامہ اقبال سے پوچھا کہ مسلم لیگ کو ایک عوامی جماعت کیسے بنایا جائے تو اقبال نے 28 مئی 1937ء کو ایک خط میں قائداعظم کو لکھا جب تک کہ آپ مسلمانان ہند کے روٹی کے مسئلے یعنی معاشی مسئلہ کا حل نہیں پیش کریں گے اور اس کا حل اسلام کے معاشی نظام کا نفاذ ہے جو ایک الگ وطن کے حصول کے بغیر ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہند کے آئینی انتظام کو دیکھا جائے تو یہاں مسلمانوں کا معاشی نظام نافذ نہیں ہوسکتا اس کے لئے بہرصورت الگ وطن کی ضرورت ہے۔ 1932ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا، اس میں مسلمانان ہند کے مسائل کے حل کے لئے اقبالؒ نے پانچ اقدامات تجویز کئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ اقدامات نہ اٹھائے گئے تو یہاں مسلمان باقی نہیں رہیں گے، ان کا حشر سپین کے مسلمانوں جیسا ہوگا۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ ایک ایسی کونسل تشکیل دی جائے جس میں مسلم فقہا یا اسلامی قانون وفقہ سے واقف علماء بھی ہوں اور جدید قانون کے ماہر بھی تاکہ وہ اسلامی قانون کو سمجھیں اور پھر اس کو ان جدید خطوط پر استوار کریں کہ وہ آج کے دور میں نافذ ہو کر مسلمانوں کے مسائل کے حل کا ذریعہ بنے۔ ہندوستان کی انگریز حکومت یا نوآبادیاتی برطانوی تسلط میں تو اس قانون کا نفاذ نہیں ہوسکتا تھا، لہذا اس کونسل کی حیثیت علمی کونسل یا مجلس کی ہوگی نہ کہ ایگزیکٹو کی حیثیت سے وہ اس کا نفاذ کر سکتی تھی۔ ہمارے مفکر یہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی قانون آج کے جدید تقاضوں کے مطابق تعبیر ہو کر نافذ نہیں ہو جاتا تب تک مسلمانوں کے مسائل کا اور کوئی حل نہیں ہے۔

1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی جس کے آخری پیرے میں درج ہے کہ'' آل انڈیا مسلم لیگ نے منٹو پارک میں یہ طے کیا ہے کہ ہم نے ان ان علاقوں پر مشتمل ایک نیا ملک وجود میں لانا ہے، لہذا مسلم لیگ کو چاہیے کہ وہ ایک کمیٹی تشکیل دے جس کے ذمہ یہ کام ہو کہ وہ بنیادی دستوری خاکہ تیار کرے کہ اگر یہ ملک ہمیں مل جاتا ہے تو ہم اسے کیسے چلائیں گے۔'' قرارداد کے اس حصے پر عمل کیلئے آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک کمیٹی بنائی، جس نے ایک منشور یا دستور کا بنیادی خاکہ تیار کیا۔ اس میں یہ طے کہ اگر نیا ملک وجود میں آیا تو یہ ملک ایک نظریے کی بنیاد پر چلایا جائے گا، اس کا نظام اسلام ہوگا اور اس ملک کے شہری ایک ملت ہوں گے۔ اور جس فکر کے تحت یہ چلایا جائے گا وہ اقبالؒ کی فکر ہوگی۔ اس خاکے کا ایک پورا الگ باب ہے جس کا عنوان ہے'' نظریہ پاکستان'' جس میں یہ تمام تفصیلات موجود ہیں۔ اور آج ادھر یہ بحث جاری ہے کہ نظریہ پاکستان کا تصور پاکستان بننے کے بہت دیر بعد وضع کیا گیا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کی ایک سب کمیٹی، جس کے سربراہ علامہ ارغب احسن تھے جو ڈھاکہ مسلم لیگ کے صدر تھے، نے اس دستوری خاکے کا 60 صفحات پر مشتمل ایک خلاصہ تیار کیا جو بعد میں قائداعظم اور لیاقت علی خان کو پیش کیا گیا۔ لہذا اسلام کے مطابق آئین، نظام اور نظریے کے نفاذ کا فیصلہ بہت پہلے کر لیا گیا تھا اور یہی فیصلہ ایک الگ ملک کے قیام کی تحریک کا سبب قرار پایا۔ یہی وجہ ہے قائداعظم نے ایک امریکی صحافی کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ پاکستان کا آئین اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق تشکیل دیا جائے گا اور اس کی تفصیلات پاکستان کی دستور ساز اسمبلی طے کرے گی۔ اسی نظریے اور مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی دستور ساز اسمبلی نے متفقہ طور پر قرارداد مقاصد منظور کی جس کی تحریک میں لیاقت علی خان وغیرہ بھی شامل تھے۔ بعد میں تمام آئین سازی میں یہ قرارداد مقاصد دیباچہ کے طور پر ہر ہر آئین یعنی 1973 & 1962, 1956ء کے آئین کا حصہ رہی ہے، آگے چل کر اس کو 1973ء کے آئین کا مکمل حصہ بنایا گیا۔

قرارداد مقاصد کے بعد حکومت کی ہدایت پر تمام مکتب فکر کے بڑے علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے سربراہ سید سلیمان ندوی تھے۔ ان سے رائے لی گئی کہ قرارداد مقاصد کی روح کے مطابق ایک اسلامی ریاست اور اس کے آئین کی تشکیل کن خطوط پر ہوگی۔ چنانچہ اس کمیٹی نے 1951ء میں 22 نکات پر مشتمل

رپورٹ پیش کی ۔ جسے دیباچہ کے طور پر آرٹیکل A-2 کے تحت آئین کا باقاعدہ حصہ بنادیا گیا۔ پھر اس آئین میں آرٹیکل 9 میں پورے کے پورے نظام کو اسلامی نظام کے مطابق چلانے کے لئے رہنما خطوط متعین کر دیئے گئے ۔آرٹیکل 7-2 کی پہلی شق میں یہ واضح ہے کہ تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے گا اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جاسکتا جو قرآن وسنت کے منافی ہوگا۔

جب آپ نے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنا ہے تو اس کے لئے علماء کی رہنمائی بھی درکار ہوگی ۔اس کا انتظام آرٹیکل 8-22 کے تحت اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کی صورت میں کیا گیا۔اس کونسل کی تشکیل اس ضمن میں کوئی پہلا قدم نہیں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ایک عظیم نومسلم یورپی سکالر اور ماہر قانون جو کہ اسلامی تعلیمات اور نظام پر بھی ایک اتھارٹی سمجھے جاتے تھے، علامہ محمد اسد کی سربراہی میں قائداعظم نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی اور ایک تحقیقاتی ادارہ ''ادارہ تحقیقات اسلامی'' کے نام سے بھی قائم کیا گیا جس کے ذمہ نئی ریاست کے لئے اسلامی نظام وقانون کی تشکیل کا کام لگایا گیا۔علامہ محمد اسد نے قرآن و احادیث کا ترجمہ بھی کیا تھا اور اسلامی فکر پر ان کی کئی کتابیں بھی موجود ہیں ۔ان کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ وہ پاکستان کے پہلے رجسٹرڈ غیر ملکی شہری ہیں، پہلا پاسپورٹ بھی انہیں جاری کیا گیا۔اس ادارے نے اس ضمن میں بڑا وسیع کام کیا جو ہمارے قومی ریکارڈ کا حصہ ہے۔اس کے بعد کے تین ضمنی آرٹیکل اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل اس کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہیں۔

جہاں آئین ختم ہوتا ہے وہاں پر بھی قرارداد مقاصد کا ضمیمہ موجود ہے، گویا اس آئین کا آغاز وانجام اس جملے پر ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات کے پاس ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور نیابت مسلمانوں کے لئے ایک امانت ہے۔ بقیہ تفصیلات آئین کے جتنے بھی آرٹیکلز ہیں ان میں موجود ہیں۔آئین کی اسلامی دفعات اس کی تشریح کرتی ہیں۔ پارلیمان یا انسانوں کا بنایا ہوا کوئی بھی قانون حتمی یا نقائص سے پاک نہیں ہوتا۔ 1973ء کے آئین کو غیر اسلامی کہہ کر مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہاں اگر اس میں کوئی نقص یا کمی ہے تو اس کی نشاندہی کریں۔لیکن اس کی نشاندہی اور متبادل کے لئے کوئی سامنے نہیں آتا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس آئین میں اگر کوئی نقص ہے تو اس کو دور کرنے کا ایک علمی اور دو عملی

راستے ہیں جن پر کوئی قدغن یا پابندی نہیں ہے۔علمی راستہ اسلامی نظریاتی کونسل آپ کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں تمام حل فراہم کرنے کے لئے تیار ہے۔عملی طور پر ایک طریقہ پارلیمنٹ ہے کہ وہاں سے ترمیم یا تبدیلی ممکن ہے جبکہ دوسرا طریقہ عوام ہیں۔اگر آپ کوئی تبدیلی چاہتے ہیں تو عوام میں شعور بیدار کریں، رائے عامہ ہموار کریں اور ایسے نمائندے پارلیمنٹ میں منتخب کروا کر بھیجیں جو آپ کے نکتہ نظر کے مطابق آئین میں تبدیلی کی تحریک کر سکیں۔لہذا نقص کو دور کرنے یا اسے مزید اسلامی بنانے میں کوئی قدغن یا کوئی رکاوٹ نہیں۔جب تک اس آئین کا بہترین اور مکمل متبادل موجود نہ ہو، اور اگر عوام مکمل طور پر آئین کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اس کی بھی گنجائش موجود ہے۔

آئین کی کسی شق کی تعبیر، تشریح اور نفاذ سے متعلق کوئی ابہام ہے تو اس کی وضاحت اور عمل درآمد کے لئے ہمارے پاس ایک اور بہترین ذریعہ ہے، وہ عدلیہ ہے۔جب قرارداد مقاصد کو بطور حوالہ سید نسیم حسن شاہ کی عدالت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ آئین کا دیباچہ ہے باقاعدہ حصہ نہیں ہے، ہم آئین کا بقیہ حصہ متاثر کر کے فیصلہ نہیں کر سکتے۔آپ کے پاس اس دستور کے ہوتے ہوئے اتنے امکانات موجود ہیں کہ آپ ایک آئیڈیل اسلامی ریاست کی تشکیل کر سکتے ہیں۔اس کا ایک اور نمونہ یا مثال پانامہ کیس پر سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے۔اس کا فیصلہ 20 اپریل 2017ء کو آیا، اس میں عدالت نے قرارداد مقاصد سے متعلق لکھا کہ آئین پاکستان کی تشکیل سے پہلے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے نظریہ پاکستان کی وضاحت کے لئے قرارداد مقاصد منظور کی۔اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور عوام کے نمائندے اسے بطور امانت استعمال کریں گے۔قرارداد مقاصد کے نکات آئین کا باقاعدہ حصہ اور اس کے نکات قابل اطلاق اور ناقابل تنسیخ ہیں۔قرارداد مقاصد کے بعض نکات نہایت شاندار ہیں ان سے فرار ممکن نہیں۔جب آپ اس دستور کی روشنی میں کوئی قانون سازی کریں گے تو وہ قرارداد مقاصد کی روشنی میں کریں گے، یہ مسلمان کی زندگی کا ایک جوہر ہے کہ وہ ذاتی زندگی میں اپنی مرضی کے فیصلے تو کر سکتا ہے لیکن خداوند تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس وقت جمہوریت ہی بہتر طرز حکومت ہے لیکن ایسی جمہوریت جو اسلام اور قرارداد مقاصد سے متصادم نہ ہو۔

آئین یا قرارداد مقاصد کی یہ تشریح کوئی مولوی، صوفی یا کوئی پروفیسر نہیں کر رہا بلکہ آپ کی سپریم کورٹ کر رہی ہے اگر چہ اس فیصلے کی نوعیت اور تفصیلات الگ موضوع رکھتی ہیں لیکن اس میں جو حصہ قرارداد مقاصد کی تشریح سے متعلق ہے وہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں آگے درج ہے۔ ''قرارداد مقاصد میں جمہوریت، مساوات، رواداری، آزادی اور سماجی انصاف کے جو اصول وضع کئے گئے ہیں وہ اسلام کی روح کے عین مطابق ہیں۔'' یہاں یہ ذکر کرنا عین مناسب ہے کہ پاکستان وہ پہلا ملک ہے جس نے اسلامی جمہوریت کا تصور لیا جس کو بعد میں دیگر کئی اسلامی ممالک نے بھی اختیار کیا۔ اگر حکومتی منبع کی صفائی کا مقصد حاصل کر لیا جائے تو ریاست کے قانون ساز اور دیگر اداروں کی صفائی خود بخود ہو جائے گی۔ اصل مسئلہ ہے قرارداد مقاصد کی روح کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے صفحہ 164 پر تحریر کیا گیا ہے کہ ہمارے آئین میں مقرر کردہ حدود کا اندازہ آئین کی ابتدائی سطور سے ہی ہو جاتا ہے، وہ سطریں جن میں لکھا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات کے پاس ہے جسے ہمارے نمائندے بطور نیابت چلائیں گے۔ جب آپ اسے آئین کی روح قرار دیتے ہیں تو آئین کے تمام آرٹیکل اس سے خالی نہیں ہوں گے۔ اگر روح باقی نہ رہی تو آئین مردہ ہو جائے گا۔ جب بھی آئین کے کسی آرٹیکل کے تحت، کسی بھی سطح پر، آپ کوئی بھی اختیار استعمال کر رہے ہیں، تو آپ کے پیش نظر یہ بات ہونی چاہیے کہ یہ اختیار آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور امانت تفویض کیا گیا ہے اور آپ اس کے استعمال پر اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جواب دہ ہوں گے اور عوام کے سامنے بھی جوابدہ ہوں گے جن کی آپ نمائندگی کر رہے ہیں۔

یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا فیصلہ ہے جس کا اختتام علامہ اقبالؒ کے شعر پر کیا گیا ہے۔ آخر میں درج ہے کہ ہمیں بحیثیت قوم عظیم قومی شاعر اور فلسفی علامہ اقبالؒ کے الفاظ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ایسی حقیقی صلاحیت تک پہنچنے کے خواہاں ہیں اور اقوام عالم میں اپنا سر بلند رکھنا چاہتے ہیں اور وہ الفاظ یہ ہیں۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اور بھی کئی کیس ہیں، جیسے ظہیر الدین کیس ہے، حاکم خان کیس ہے، جن میں قرارداد مقاصد اور آئین کے اندر اسلامی دفعات کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور آئین کے بقیہ حصوں پر ان کی فوقیت اور بطور آئین کی روح کے ان کے اطلاق کو واضح کیا گیا۔ تو ہم نے ان تمام امکانات اور حقائق کو پیش نظر رکھنا ہے، ان کی روشنی میں آئین کے اسلامی ہونے کا پہلو نہایت غالب ہے۔ ہائی کورٹ میں بھی بہت سارے ایسے فیصلے ہیں جن میں یہ وضاحتیں موجود ہیں۔ لہذا ہم نے بند گلی کے بجائے کھلے راستے اختیار کرنے ہیں جن پر چل کر ہم مثالی اسلامی ریاست کی تشکیل کی طرف بڑھ سکیں۔

سوال: اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ کے فیصلے کے مطابق ابھی تک سود کا خاتمہ کیوں نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس کا متبادل نظام وضع کیا گیا ہے۔

جواب:

اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ ربا یعنی سود کے خاتمے کی شق تو آئین میں موجود ہے کہ سود ختم کیا جائے، اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اس سلسلے میں کافی کام کیا ہے۔ اسی طرح سپریم کورٹ کے متذکرہ فیصلے کو بھی آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ جب یہ کیس سنا جا رہا تھا تو سپریم کورٹ نے پورے ملک میں جتنے اہل علم ہیں ان سب کو یہ دعوت دی تھی کہ آپ آئیں اور تحریری، تقریری یا ذاتی حیثیت میں آ کر اپنے موقف کو بیان کریں، تو لوگوں نے اپنا موقف پیش کیا۔ آج جو معیشت کا حال ہے پہلے جیسا نہیں، اب معیشت بہت آزاد اور رواں ہو چکی ہے۔ بہت سارے پہلے کے تصورات اب قابل عمل نہیں رہے، آپ نے ان تصورات کی تعبیر نو کرنی ہے۔ اس فیصلے میں ایک سوال بھی شامل تھا، اور وہ سوال یہ تھا کہ ربا کیا ہے؟ ابھی تک ہمیں ایسا کوئی مسلم ماہر قانون نہیں ملا جو آج کے دور میں ربا کی واضح تعریف کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ سپریم کورٹ نے تمام اہل علم اور سٹیٹ بنک کو بھی یہ ٹاسک دیا تھا کہ آپ اسلامی معیشت کے لئے دستاویز تیار کریں۔ جب تک آج کی معیشت کا باریک بینی سے جائزہ نہیں لیں گے آپ کوئی متبادل نظام نہیں پیش کر سکتے۔ لیکن اسلامی نظام معیشت کی دستاویز ابھی تک سامنے نہیں آسکی اور یہ معاملہ ابھی تک کورٹ میں ہے۔

ڈاکٹر محمد ایوب صاحب ہمارے دوست ہیں، وہ سٹیٹ بنک میں شعبہ اسلامی معیشت کے سربراہ

ہیں، انہوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے کہ سٹیٹ بنک کے نزدیک اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اب سٹیٹ بینک یہ کہتا ہے کہ ہم نے فکری بنیادیں فراہم کردی ہیں اب علماء کا اس کے بارے میں کیا مؤقف ہے وہ آپ جانتے ہیں۔

بنیادی طور پر معاشی نظام کو بدلنے کے لئے جو ابتدائی نمونہ یا مثال چاہئے یا جو فریم ورک یا بنیادی فکری، علمی اور دستاویزی ماڈل درکار ہے، جب تک کہ وہ مکمل طور پر تیار نہیں کیا جاتا ہم اس نظام کو کا متبادل پیش نہیں کر سکتے۔

قائداعظمؒ نے اپنی آخری تقریر میں سٹیٹ بینک سے خطاب میں یہ کہا تھا کہ یہ بینک اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ اسلام کا ایسا معاشی نظام سامنے لیکر آئے جو مغرب کے سرمایہ دارنہ معاشی نظام کا متبادل ہو۔ اسلام کا معاشی نظام قیام پاکستان کے مقاصد میں سے ایک بڑا اور اہم مقصد ہے۔ لیکن اجتماعی طور پر ہمیں جو کردار ادا کرنا چاہئے وہ ہم نہیں ادا کر سکے۔ اس کے لئے جدید خطوط پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک اور سیمینار میں جب اسی موضوع پر بات ہوئی تو سوال کیا گیا کہ پھر آخر اس کا حل کیا ہے۔ تو آپ کو اس کا جواب امریکہ کے خلائی پروگرام کی مثال سے دونگا کہ امریکہ کے تمام خلائی مشن ناکام ہو گئے لیکن آخر میں اپالو-11 کامیاب ہو گیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ پہلے مشن کی ناکامیوں کو نوٹ کیا گیا اور پھر اس کے حل کے لئے ایک لاکھ سائنسدان اکھٹے کئے، اور ایک ایک سوال تین تین سائنسدانوں کے سامنے رکھا گیا۔ ان میں ہر ایک سائنسدان تخلیقی سائنسدان تھا۔ انہوں نے اس وقت ایک لفظ دیا Attention to the detail جو بعد میں پوری دنیا میں اپنایا گیا۔ پہلے انہوں نے اس کے جوابات تلاش کئے تو کامیابی ہوئی۔ الغرض اسلامی معیشت کے متعلق جتنے بھی سوالات ہیں ان کے جوابات کے حصول کے لئے پاکستان کی تمام جامعات میں معاشیات کے پروفیسرز، ریسرچ سکالرز اور مدارس کے اساتذہ واہل علم اور تحقیق کرنے والے علماء کو کم از کم ایک سال کے لئے اسلام کے معاشی نظام کے موضوع پر جمع کرنے کا ٹاسک دے دیا جائے تو ان سوالات کے جواب مل جائیں گے۔

اب اگر اسلامی نظریاتی کونسل کے کردار پر بات کی جاتی ہے تو یہ محض مشاورتی ادارہ ہے ایگزیکٹو

نہیں ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل محض سفارشات دے سکتی ہے ان پر عملدرآمد نہیں کرواسکتی۔ اگر بنکوں میں کوئی اسلامی بنکنگ کے نام پر متوازی نظام چلا رہا ہے تو لوگ اس کی پیروی کریں، مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ ڈیگال سے کسی نے پوچھا کہ فرانس کے لوگ مسلمان ہو رہے ہیں اور اگر 50% مسلمان ہو گئے تو پھر کیا ہو گا۔ تو اس کا جواب تھا کہ پھر میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا۔ اگر لوگ اسلامی بنکنگ اختیار کر لیں تو دوسرا نظام خود بخود ختم ہو جائے گا۔

ایک اور سوال یہ کیا جاتا ہے کہ جمہوری نظام کا متبادل اسلام کی نظر میں کیا ہے، تو آج کے دور میں جمہوریت کے علاوہ ہمیں ابھی کوئی ایسا بہترین متبادل نظر نہیں آ رہا جس میں شہریوں کے لئے اسلام کے بیان کردہ حقوق و مفادات کا اس انداز سے تحفظ کیا گیا ہو جیسا کہ موجودہ نظام کے اندر ہے۔ اقبالؒ نے بھی اسلام کے جمہوری و اقتصادی اصولوں پر مبنی نظام کو روحانی جمہوریت کا نام دیا ہے۔ جمہوریت کے مدمقابل خلافت راشدہ کی مثال دی جاتی ہے تو اس میں بھی خلیفہ کے انتخاب کے وقت اہلیت اور عوامی رائے کو مدنظر رکھا گیا تھا، جو آج کے جمہوری نظام میں بھی موجود ہے۔ عوامی رائے کا تحفظ اور احترام آج کے دور میں سوائے موجودہ نظام کے کسی اور نظام میں ممکن نہیں اگر ایسا ہے تو وہ نظام سامنے لیکر آئیں۔ خلفائے راشدین کا مثالی نظام، معاشرے اور افراد کی بہترین تربیت کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا جس میں بہترین افراد کی اکثریت نے اپنے میں سے بہترین کا انتخاب بطور خلیفہ کیا تھا۔

جمہوریت اور جمہوری اقدار کے فروغ میں علمائے کرام کا کردار

مولانا عبدالقدوس ساسولی

مرکزی رہنما جمعیت علمائے پاکستان، بلوچستان

پاکستان بننے کے بعد جن اہل، دیانتدار اور دین دار افراد کی ضرورت تھی، بدقسمتی سے وہ حکومت کا حصہ نہیں بن سکے۔ ریاستی معاملات میں علماء وہ کردار نہیں ادا کر سکے جو انہیں کرنا چاہئے تھا۔ سیکولر قوتیں ہمیشہ سے پاکستان کے قیام کے اصل مقاصد یعنی نفاذ اسلام کے خلاف رہی ہیں، وہ مذہبی قوتوں کو تقسیم کرنے کے حق میں رہے۔ پھر بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ میں بھی انگریز کے تربیت یافتہ لوگ تھے۔ ملک میں 26 سال تک تو متفقہ آئین بھی نہیں بن سکا۔ اگرچہ آئین کو اسلامی نہج پر استوار کرنے کے لئے علماء کی بڑی کاوشیں ہیں لیکن اصلاً نظام تو غیر مذہبی قوتوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوابوں کے ہاتھ میں رہا ہے جس کی وجہ سے صحیح اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکا۔ جب 1956ء کے آئین میں اسلامی جمہوریہ کے حوالے سے شق شامل کی گئی تو بھی سیکولر حلقوں نے بڑا شور کیا کہ دنیا ہمارے بارے میں کیا کہے گی۔ اس سے پہلے 1952ء میں علماء نے اسلامی آئین کی تشکیل کے لئے تمام مکتب فکر کے علماء، جن میں سید ابوالبرکات قادری، سید سلمان ندوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ظفر احمد انصاری وغیرہ شامل تھے، نے دس روزہ اجلاس کے بعد آئین کی تشکیل کے لئے سفارشات پیش کیں۔ ان کاوشوں کے تسلسل میں 1973ء کا متفقہ آئین سامنے آیا، جس میں بہت ساری اسلامی دفعات شامل کی گئیں۔

اس وقت کی اسمبلی میں مختلف جماعتوں جمعیت علمائے پاکستان، جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام کے بہت سارے ارکان تھے جن کی کاوشوں سے آئین میں اسلامی جمہوریہ کے خدوخال واضح کرنے کے لئے بہت ساری دفعات شامل ہوئیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ قادیانیوں کو بعد

میں ایک ترمیم کے ذریعے غیر مسلم قرار دیا گیا، اس متفقہ آئین 1973ء کو ہرگز غیر اسلامی نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ تمام مذہبی جماعتوں نے اس آئین کی منظوری دی تھی۔ کچھ گروہوں کے نزدیک پارلیمانی نظام اور مغربی جمہوری نظام خلاف اسلام ہے لیکن مجموعی طور پر اس آئین میں کہیں بھی خلاف اسلام شقیں نہیں جن میں کھلے طور پر اسلام کی بنیادی تعلیمات سے انحراف کیا گیا ہو۔ ہاں اس آئین کو مزید اسلامی بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ جو آئین اور قانون ہمارے سامنے موجود ہے اگر اسی پر عمل کیا جائے تو ملکی اور ریاستی نظام میں بہت ساری بہتری لائی جا سکتی ہیں۔ خرابیاں دور ہو سکتی ہیں پھر آہستہ آہستہ آئین میں مزید تبدیلی اور بہتری لائی جا سکتی ہے۔ اسلام کے نفاذ میں سیکولر اور لادین عناصر رکاوٹ رہے ہیں لیکن اس سلسلہ میں ہمیں بغیر کسی فرقہ کی تمیز کے متفقہ طور پر لائحہ عمل طے کرنا چاہئے۔ تمام مسالک کے علمائے کرام پاکستان کے نظام میں بہتری لانے اور اسے مزید اسلام کے حقیقی خطوط پر استوار کرنے کے لئے مل کر لائحہ عمل طے کر کے مشترکہ جدوجہد کریں۔

ڈاکٹر عمیر صدیقی صاحب

اسٹنٹ پروفیسر اسلامک سٹڈیز جامعہ کراچی

ہمیں اپنے آئین کے عملی نفاذ کے لئے کوشش کرنا ہوگی جو کہ بڑی حد تک اسلام کے قریب ہے۔ اس میں ختم نبوت کے عقیدے کا تحفظ کیا گیا ہے۔ جب ہم اسلامی نظام کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد قائداعظم اور علامہ محمد اقبال کا وہی ویژن ہے جس کے مطابق نئی مملکت کو ایک اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنانا تھا، اس سے مراد تھیوکریسی نہیں یعنی پاپائیت یا ملائیت نہیں ہے۔ دین کا ایک ہی ورژن ہے جو آپ ﷺ نے ریاست مدینہ کی صورت میں پیش کیا، یہی ویژن ہمارے آئین میں موجود ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر مکمل طور پر عملدرآمد کیا جائے۔ ہمارے آئین میں یہ درج ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری کائنات میں اقتدار اعلیٰ کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ آئین میں یہ بھی درج ہے کہ یہاں قرآن وسنت کے مغائر کوئی بھی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ آرٹیکل 31 میں واضح ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ اگر

کوئی اسلامی ملک ہے اور وہاں آپ کسی بھی مذہب کے شہری یا اپنی ذاتی جان و مال کی حفاظت کیلئے مر جائیں تو احادیث مبارکہ کے مطابق آپ شہید ہیں۔

ایک سوال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے نفاذ کا طریق کار کیا ہونا چاہئے۔ چونکہ ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ اسلام کے عملی نفاذ کی ایک یہی صورت ہے کہ کسی بھی طریقے سے طاقت یا اقتدار میں آ کر ہی اوپر سے نیچے کی سطح تک اسلام کا نفاذ عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیا میں یہ نظریہ عام ہے کہ نظام کی تبدیلی اور بہتری صرف اقتدار میں آنے کے بعد ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ میں اس سے اختلاف کرتا ہوں کیونکہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام عبادات و معاملات، خاندان اور معاشرتی نظم پر عملدرآمد کی آزادی حاصل ہے۔ اگر ہم آئین و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ان چاروں باتوں پر عمل کریں تو آہستہ آہستہ تبدیلی اور بہتری لائی جا سکتی ہے۔

میاں جاوید لطیف

رہنما پاکستان مسلم لیگ و ممبر قومی اسمبلی

میں سمجھتا ہوں کہ علمائے کرام جہاں اپنے اپنے سامعین اور عوام کو آخرت میں نجات کے لئے دین کا راستہ بتاتے ہیں، وہاں انہیں یہ درس بھی ضرور دینا چاہئے کہ دین پر عمل کے ساتھ ساتھ فلاح انسانیت کے لئے بھی کام کرنا بھی نجات کا ذریعہ ہے۔ جس نے آپ ﷺ سے محبت کی، وہ ضرور فلاح انسانیت کا کام کرتا ہے۔ وہ لوگ جو کلمہ گو نہیں ہیں اگر فلاح انسانیت کے لئے کام کر رہے ہیں تو کم از کم وہ اس جہاں میں خوشحال ضرور ہیں۔ دنیا بڑی عرق ریزی سے اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ فلاح انسانیت کے لئے جمہوریت اور ووٹ کا تقدس ضروری ہے۔ اگر آپ نے خدمت کرنی ہے تو ایک نظام کا حصہ بننا ضروری ہے۔ جمہوریت یا پارلیمانی نظام میں زیادہ بہتر طریقے سے خدمت ممکن ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ آپ ایک کلمہ گو ہیں تو عوام کی اس خدمت کے نتیجے میں دنیا اور عاقبت دونوں میں فلاح حاصل ہوگی۔ یعنی آپ اس صورت میں درحقیقت اپنے دین پر ہی عمل کر رہے ہوں گے، اس طرح ہمیں دنیا و آخرت دونوں کا فائدہ حاصل ہوگا۔ ہم علمائے کرام سے اچھے کردار کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم سوسائٹی میں ان کو اعلیٰ درجے پر

دیکھتے ہیں اور اسی کے مطابق ان سے توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ باشعور لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں جو غلطی کر سکتے ہیں، لیکن میرے جیسے عام آدمی کا دل ان سے بیزار ہو جاتا ہے جب وہ ان میں کوئی کمی یا غلطی دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پارلیمانی جمہوریت کی بات کی، میں اگر نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ چاہتا ہوں تو میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا، نہ ڈنڈے یا بندوق کے زور پر یہ نظام نافذ کر سکتا ہوں۔ مجھے رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے دوستوں اور ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ جیسے علمائے کرام یہ کام کریں تو دو چار سال کے اندر اندر رائے عامہ تیار کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ تمام افراد خلوص نیت سے کام کریں، اور کوئی بھی شخص یا گروہ اپنے اپنے الگ سیاسی ایجنڈے پر کام نہ کرے۔ آج عالم اسلام کو بڑے چیلنج درپیش ہیں۔ ایک طرف ماڈرن اسلام کی بات کی جاتی ہے، دین کی حفاظت کرنے والی اللہ کی ذات ہے مگر اس میں جو جو اضافے کئے جا رہے ہیں انہیں روکنا آپ کا کام ہے۔ آپ سے ہم نے سیکھ کر اس پر عمل کرنا ہے۔ آج تمام اسلامی ممالک میں افراتفری اور فرقہ واریت ہے، ان فتنوں سے ہمیں کمزور کیا جا رہا ہے۔ مشاورتی عمل کو بڑھاوا دینا ہی پارلیمانی نظام کا حاصل ہے جس سے مسائل حل ہوں گے۔ ایک ادنیٰ خادم رسول ﷺ کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے جذبات سے نہیں کھیلنا چاہئے، بلکہ انہیں کنٹرول کر کے صحیح سمت کی طرف لے جانا چاہئے۔ ان جذبات سے اپنے دین اور ریاست کے لئے کام لینا چاہئے۔ ہم نے اپنی سمت درست کر دی تو یہ اگلی نسلوں پر احسان ہوگا۔ ہم سب مسلکی تقسیم سے ہٹ کر دین کے تقاضوں پر عمل کریں گے تو پاکستان کی سلامتی ممکن ہے ورنہ یہاں حالات دیگر مسلم ممالک سے بھی زیادہ خراب ہونگے۔

اسلام میں ووٹ کی اہمیت

ملک سکندر ایڈووکیٹ

قائد حزب اختلاف، بلوچستان

آمریت، جبر، ظلم اور موروثی حکمرانی انسانی تاریخ کا حصہ ہے، پھر آہستہ آہستہ جمہوری رائے کو اہمیت دی جانے لگی اور اس بات کو ضروری سمجھا گیا کہ حق حکمرانی میں عوام کو بھی حصہ دیا جائے، اس کے لئے رائے دہی کا تصور پیش کیا گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ظالم حکمران اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں، وہ جمہوری اقدار یا عوامی رائے کو اہمیت نہیں دیتے، اس طرز حکمرانی کو موروثیت کے ذریعے جاری رکھا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود آزاد سوچ رکھنے والوں، غلامی کی زنجیریں توڑنے والوں نے جمہوریت کی تشکیل اور فروغ کے لئے بہت کام کیا ہے۔ مختلف طبقات اور افکار کو جمہوریت کا حصہ بنایا گیا ہے، مثلاً قومیت کو بنیاد بنا کر انہیں نمائندگی دی جاتی ہے۔ لسانیت اور علاقائیت کو بھی جمہوری اقدار میں لایا جاتا ہے، لیکن انسان کے خالق و مالک نے اس حوالے سے اپنے نظام میں ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ اس میں ایک فکر جنم لیتی ہے کہ یہ جو قبائل اور گروہ ہیں یہ تعارف کے لئے ہیں۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم بے شک تم میں سے بہتر وہ ہے جو اللہ کے ہاں تقویٰ میں بہتر ہے۔

اگر اس بنیاد پر جمہوری عمل اور جمہوری اقدار تشکیل دی جائیں تو وہ معاشرہ خوشحال اور پرامن ہوگا۔ لوگ انتشار اور فتنہ میں بھی مبتلا نہیں ہوں گے۔ اس کی ایک جھلک آپ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں نظر آتی ہے جب کوئی زکواۃ لینے والا بھی نہیں ملتا تھا۔ ہمارے ہاں کیسی جمہوریت ہے یا باقی دنیا میں کیسی ہے؟ اس کا اندازہ موجودہ حالات کو دیکھ کر آپ خود لگا سکتے ہیں۔

ووٹ کی کیا اہمیت ہے، ووٹ ایک شہادت ہے۔ دنیا کے تمام ادیان اور تمام فلسفے زبانی و تحریری طور

پر یہ کہتے ہیں کہ آپ حق کے لئے شہادت دیں۔ جب آپ ووٹ دیتے ہیں تو یہ بات مدنظر رکھیں یا یہ تصور کر لیں کہ آپ علاقے، ملک اور قوم کے مفاد کے لئے ایک شہادت ثبت کر رہے ہیں، اگر یہ شہادت درست ہوگی تو اس کے الگ ثمرات ہوں گے، اگر یہ غلط ہوگی تو اس کے الگ ثمرات ہوں گے۔ آپ کے ووٹ سے منتخب ہونے والا نمائندہ اگر اچھا کام کرے گا تو اس میں ووٹر کی شہادت بھی شامل ہوگی۔ خیر کے اندر ووٹر کا ایک حصہ ہوگا اور اگر وہ برائی کی راہ پر چلے گا تو ووٹر بھی اس برائی میں حصہ دار ہوگا۔ ایک ووٹ کی اتنی اہمیت ہوتی ہے کہ محض ایک ووٹ بھی کسی وقت انتخاب میں حتیٰ کہ وزیراعظم کے انتخاب میں بھی فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں عوامل وعواقب سے ووٹر کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔ ووٹر کی سفارش ایک امانت ہے جس کا صحیح استعمال اس کے لئے نہ صرف دنیاوی اثرات کا حامل ہوگا بلکہ آخرت میں بھی وہ اچھے یا برے امر کا حقدار ہو گا۔ اسی طرح منتخب ہونے والے نمائندے بھی اپنے اختیار کو ایک امانت سمجھتے ہوئے، خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس کے ساتھ، اچھے برے کی تمیز کر کے اپنا کردار ادا کریں گے تو اچھے ثمرات دنیا اور عاقبت دونوں میں فائدہ مند ہوں گے، ورنہ غلط روی سے وہ دونوں جہانوں میں قابل مواخذہ ہوگا۔

علمائے کرام نے اپنی تحقیق میں بھی ووٹ کی اہمیت پر بہت روشنی ڈالی ہے اور اظہار رائے کو امانت کے طور پر استعمال کرنا فرض قرار دیا ہے۔ آج ہم سب کو گلی، محلے سے لیکر قومی وملکی سطح تک ہر جگہ تعلیم کی ضرورت ہے، کیونکہ تعلیم کے بعد ہر شخص اچھے برے کی پہچان کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ ظالم، سردار، جاگیردار اور استحصالی سرمایہ داری کا ساتھ نہیں دے گا بلکہ اچھے اور سچے لوگوں کا ساتھ دے گا جن کے انتخاب سے ملک و معاشرے میں کوئی بہتری لائی جا سکے گی، کیونکہ تبدیلی تعلیم یافتہ افراد ہی کے ذریعے لائی جا سکتی ہے۔

ہمارے نبی آقائے نامدار ﷺ کی ذات ایک معجزہ ہے۔ آپ کے اقوال، علم اور آیات چودہ سو سال گذرنے کے باوجود رہنمائی کے لئے معجزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علماء کا کردار جو تاریخ میں آیا وہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے رہا ہے، نہایت قابل قدر ہے۔ اسی طرح وہ تعلیم وتعلم اور علم دین کے فروغ کے لئے جو کردار ادا کر رہے ہیں وہ بھی نہایت قابل قدر ہے۔ جو دین آج پندرہ سو سال کے بعد ہم تک اور پوری دنیا تک بغیر زیر اور زبر کی تبدیلی کے پہنچا ہے وہ علمائے کرام نے پہنچایا ہے اور اس کے لئے طرح طرح

کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔علمائے کرام کواللہ تعالیٰ نے بغیر کسی ووٹ کے رہنمائی کے لیے مقرر کیا ہے۔ یہ عزت دین کی بدولت ہے ۔اگر آپ معاشرے سے الگ تھلگ رہیں گے تو لوگ گمراہی کی طرف جائیں گے۔ ہمارے مسائل، گمراہی اور خرابیوں کی وجہ یہی ہے کہ آپ نے عوام کی سطح پر، ان کے اندر رہ کر، ان کے پاس جا کر رہنمائی نہیں کی، ان کی اصلاح نہیں کی۔آج آپ کو یہ کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔اس لئے میری گذارش ہے کہ معاشرے کی اصلاح وفلاح کے لئے آپ اپنا کردار ادا کریں۔ اللہ کا دین کسی مسجد، مدرسے یا کمرے میں رکھنے کے لئے نہیں ہے، یہ ساری دنیا کے لئے ہے، اس کے نفاذ اور فروغ وابلاغ کے لئے علماء کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے۔

اگر آپ اپنا کردار ادا کریں تو چور، قاتل، ظالم اور ڈاکو منتخب ہو کر اسمبلیوں میں نہیں آسکیں گے۔ لہذا جمہوری عمل میں ووٹ کے صحیح استعمال کے لیے رہنمائی کرنے میں بھی علمائے کرام اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔اقلیتوں کو ہمارے قانون میں پورا تحفظ حاصل ہے۔قانون سے زیادہ ہمارے رویوں میں بھی سنت کے مطابق ان کے لئے رواداری ہونی چاہیے۔1973ء کے آئین کی تشکیل میں بھی علماء کا اہم کردار رہا ہے، اس پر عملدرآمد کرنا بھی ہر پاکستانی کا فرض ہے۔علمائے کرام بھی بطور شہری اس پر عملدرآمد کے لئے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔آئین میں جو کچھ لکھا ہے اس پر صحیح عملدرآمد کی تحریک کر سکتے ہیں۔اقتدار اعلیٰ کا جو تصور آئین کے ابتدائیہ میں دیا گیا، اس کے تحت ہم سب اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیارات کو بطور نیابت استعمال کریں۔ جس کی طرف علمائے کرام کی توجہ کی ضرورت ہے کہ کیا ہم نیابت الٰہی اور قرآن وسنت کے اصولوں اور قوانین کے مطابق اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔آئین میں درج اصولوں کے مطابق شہریوں کو اسلام کے اصولوں یعنی قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے مواقع فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری قرار پایا ہے، اس کے لئے بھی علمائے کرام کی ہر وقت رہنمائی کی ضرورت ہے۔

بین الاقوامی قوانین ومعاہدات اور اسلامی تعلیمات

مولانا عمار خان ناصر

وائس پرنسپل الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ

ہمارے مذہبی ذہن بنیادی طور پر جمہوریت پر مبنی نظام معاشرت کو قبول نہیں کرتے۔ جمہوریت کے بہت سے عناصر کے بارے جواز نکالا جا سکتا ہے، لیکن اس کے بہت سارے نئے پہلو ہیں جو ہمارے نظام خلافت کی اساس سے بہت مختلف ہیں۔ انہیں سمجھنا بہت اہم ہے اور یہ نشاندہی فکری جرأت کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ آج جمہوری نظام پوری دنیا پر غالب ہے۔ اس کی خامیوں پر کھل کر بات نہیں کی جاتی بلکہ قدرے جھجھک اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جو کسی بھی نتیجہ خیزی کے لئے مانع ہے۔ جمہوریت سے مصالحت گویا جبر کا تقاضا ہے کیونکہ اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی راستہ اور طریقہ نہیں ہے۔ ہم خلافت کے ماڈل سے جمہوریت کے ماڈل کی طرف تبدیلی کو اصولاً تسلیم نہیں کرتے۔ ہم جمہوریت کے بارے میں کئی اعتراضات گنواتے ہیں، مثلاً جمہوریت میں عالم اور جاہل سب برابر ہیں، مسلمان وغیر مسلم بھی یکساں ہیں، شرعی فیصلوں کا اختیار علماء کے پاس نہیں بلکہ شریعت سے نابلد ارکان پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے، جس میں کوئی بھی شرعی قانون اس وقت تک قانون نہیں بن سکتا جب تک پارلیمنٹ منظوری نہ دے۔ اللہ کا قانون اپنے نفاذ کے لئے بندوں کی منظوری کا محتاج ہے۔ جمہوریت میں ریاست اور جہاد کا تصور ہے وہ اسلامی خلافت کے تصور سے مختلف ہے۔

اسلام کا آغاز بادشاہت کے دور میں ہوا جس میں ایک بادشاہ یا شاہی خاندان آمر مطلق ہوتا تھا۔ شخصی یا خاندانی بادشاہوں میں انسانی آزادی یا حق خودارادیت کا تصور نہیں ہوتا۔ آج کی قومی ریاست کے تصور کے مطابق کوئی ملک کسی دوسرے ملک کی حدود میں مداخلت یا قبضہ نہیں کر سکتا، یہ بین الاقوامی قوانین کے

خلاف تصور ہوگا۔ پہلے وقتوں میں ایسا کوئی دستور نہیں تھا۔ کوئی بھی طاقتور سلطنت اپنی طاقت اور زور بازو سے جو بھی دوسرا ملک یا علاقہ فتح کرے گی وہ قانوناً اس کا حصہ شمار ہوگا۔ اسی سلطنت کے احکامات اور قانون وہاں لاگو ہوں گے۔ ہماری فقہ میں دارالسلام یا خلافت کا تصور ہے وہ پرانے نظام سلطنت کی ایک مذہبی شکل ہے۔ اس میں ایک وسیع تر خطے پر دارالسلام قائم ہے جن میں مرکزی خلیفہ سارے اختیارات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ تاحیات مقرر کیا جاتا ہے، جب تک وہ کافر نہ ہو۔ اس کو برطرف کرنے کا عموماً کوئی جواز نہیں ہوتا، پھر وہ اپنا ولی عہد مقرر کرسکتا ہے۔ اگر اسے کوئی دوسرا اقتدار سے الگ کر کے اپنا اقتدار قائم کرتا ہے تو وہ بھی بالفعل جائز خلیفہ ہوگا۔ دارالسلام کے تصور میں توسیع یا جہاد بھی شامل ہے، تاوقتیکہ پورے عالم پر اسلام کا غلبہ ہو جائے۔ وہاں شہریوں میں رائے دہی کے اعتبار سے برابری نہیں ہوتی۔ مسلمان وہاں مکمل شہری کا درجہ رکھتے ہیں، غیر مسلم مکمل شہری نہیں ہوتے مگر انہیں حقوق کا پورا تحفظ دیا جاتا ہے، وہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے مساوی نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں اہم عہدے دیئے جاتے ہیں۔

قومی ریاست میں سارے تصورات اس کے برعکس ہیں۔ قومی ریاست میں جہاد کو کوئی امکان نہیں۔ اگر آپ نے قومی ریاست کا اصول مانا ہے تو اس میں ریاست کی توسیع کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا، صرف اپنے دفاع کے لئے لڑ سکتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تحت لوگ صرف اپنے علاقے کے دفاع تک محدود رہتے ہیں۔ قومی ریاست میں خلافت اور جہاد دونوں کالعدم ہو جاتے ہیں۔ پہلے اسلامی ریاست ایک یا دو حصوں پر مشتمل تھی، اب مسلمان ممالک 60 کے لگ بھگ ہیں جن پر کوئی مرکزی حکمرانی نہیں ہے۔ داخلی طور پر حکومتوں کو چلانے کا نظام جمہوریت ہے جس میں انتخابات کے ذریعے کارکردگی کی بنیاد پر ایک محدود مدت کے لئے کسی شخص یا پارٹی کو اقتدار میں لایا جاتا ہے۔ اسی ذریعے سے حکومت میں تبدیلی بھی لائی جا سکتی ہے۔ تمام شہری رائے دہی کا یکساں درجہ رکھتے ہیں، مسلم و غیر مسلم کی تخصیص نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے اگر مذہبی ذہن قومی ریاست یا جمہوریت کے موجودہ ماڈل کو قبول نہیں کرتا، اس کے ساتھ اپنے آپ کو آرام دہ محسوس نہیں کرتا، تو یہ بے وجہ نہیں ہے۔ یہ دو مختلف اور متضاد سیاسی ماڈلز کا اختلاف ہے۔ ہمارے تاریخی، مذہبی اور سیاسی شعور میں حکومت کا جو ماڈل ہے وہ خلافت ہے، اور جس دنیا

میں ہم رہتے ہیں اس میں خلافت کے تمام جو بنیادی خصائص ہیں وہ ختم ہو چکے ہیں۔ جہاد ختم ہو گیا، مرکزیت اور مسلمانوں کی بالادستی ختم ہوگئی۔ یہ بات ایک مذہبی ذہن کو پریشان کرتی رہے گی۔ ایسی صورت میں مذہبی ذہن اپنے فکری اختلاف اور بے چینی کو فکری انداز میں بیان نہیں کرتا، اس کے پاس اختلاف کے اظہار کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ کافر ہے، یہ مرتد ہے، یہ کفر ہے وغیرہ وغیرہ یعنی صرف فتویٰ ہی اس بے اطمینانی کا اظہار ہے۔ چونکہ یہ ایک بیزاری کے انداز میں کیا جاتا ہے اس لئے عام معاشرہ جو جمہوریت کے نظام کے اندر رچ بس گیا ہے اسے قبول نہیں کرتا۔ یوں انہیں قدامت پسند، بیزار اور رجعت پسند کہا جاتا ہے۔

اس خلا کو سمجھنا اور پر کرنا ہماری ذمہ داری بھی ہے اور مجبوری بھی۔ مذہبی فکر اپنے مقدمے کو سیاسی زبان میں اس طریقے سے بیان کرے کہ تمام طبقہ اسے مانے یا نہ مانے اسے سمجھ تو آئے کہ کیا بات کی جارہی ہے۔ خلافت اور جمہوریت میں کیا فرق ہے۔ اسلام کے تصور ریاست وسیاست میں جہاد کی کیا اہمیت ہے اور موجودہ ماڈل میں جہاد کا تصور کیوں قابل عمل نہیں۔ اسلامی ریاست میں مساوات اور مسلم وغیر مسلم کا فرق کیا ہے اور کیوں ہے۔ ہماری یہ کیفیت ہے کہ ایک بچہ جس کا موڈ خراب ہے، وہ بے چینی میں ادھر کی چیزیں ادھر پھینکتا ہے مگر اپنی بے چینی کا استدلال نہیں بیان کرسکتا۔ ہم کہ دیں گے بچہ ہے پتہ نہیں کیا کر رہا ہے، ہم اس کی بے چینی کی اصل وجہ نہیں تلاش کریں گے۔ فکری طور پر چونکہ وضاحت کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے تو اس کے لئے دو کام ہیں تاکہ مذہبی فکر کا مقدمہ لوگوں کے لئے قابل فہم ہو سکے۔ ایک تو یہ کہ اگر ہم جمہوریت کو قبول نہیں کرتے تو اس کو قبول نہ کرنے کی وجوہات علم سیاسیات کی زبان میں بیان کریں، وہ چاہے عملاً کسی کو اچھا لگے یا نہ لگے، مگر علمی سطح پر بات قابل فہم تو ہونی چاہئے۔ مغربی فکر کے برعکس اسلامی ریاست کے جو تصورات ہیں، ان کی جو علمی وفکری بنیادیں ہیں، ان کے بارے میں جدید ذہن تک بات پہنچانے کے لئے علمی وفکری کاوشوں کی ضرورت ہے۔ علمی مقدمے اور استدلالات کی صورت میں اپنے مؤقف کی وضاحت کریں۔

ایک اور اہم پیش رفت جس کی بنیادیں ہمارے ماضی قریب میں بھی ملتی ہیں، بین الاقوامی قوانین حکومتوں کے کردار کو محدود کر رہے ہیں۔ نئے عالمی منظر میں یا گلوبلائزیشن میں حکومت کا زیادہ سے زیادہ کردار بین الاقوامی قوانین کی پیروی تک محدود ہوگا۔ دنیا کے اندر اٹھارویں صدی کے بعد جو تبدیلیاں آئی ہیں اور

خاص طور پر ہمارے برصغیر کے مفکرین نے ان بین الاقوامی تبدیلیوں کے اندر رہتے ہوئے مصالحت کے ساتھ اپنا کردار کرنے کے لئے اپنے اپنے بیانیہ یا فکر کا اظہار بھی کیا ہے۔ لہذا دوسرا کام یہ ہے کہ جو علماء یا گروہ اس فکر کے قائل ہیں کہ خلافت کے بجائے موجودہ جمہوری ماڈل کے اندر رہتے ہوئے بطور فرد، نظام اور حکومت اسلام کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات پر عملدرآمد کے تقاضوں سے عہدہ براء ہو سکتے ہیں اس کے لئے، جیسا کہ برصغیر کے پہلے علماء نے علمی وفکری بنیادوں پر کام کیا ہے، موجودہ وقت کے علماء انہی خطوط پر غور فکر اور علمی استدلال کے ساتھ اپنا بیانیہ واضح کریں۔ کیونکہ تبدیلی دنیا کے نظام کا تسلسل اور اس کا تقاضا ہے ۔تہذیب وتمدن میں ترقی اور فروغ تبدیلی ہی کے مرہوں منت ہے۔ اس تبدیلی کے باعث انسانی معاشروں کی ساخت اور تشکیل مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔ اگر آپ شاہ ولی اللہؒ کی بحث اور اس سے پہلے ابن خلدون کے مباحث کو دیکھ لیں کہ انسانی معاشرہ کیسے تشکیل پاتا ہے اور انسان انہیں بنیادی ضروریات خوراک اور لباس کے لئے کیا کرتا ہے، پھر گھر معاشرے، قبیلہ، کنبہ اور شہری زندگی کا ارتقاء ہے۔ پھر حکومتوں کا ارتقاء ہے، اقتدار کی تشکیل وغیرہ کے تصورات میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ برصغیر میں جن علماء نے کام کیا ہے، انہوں نے انہیں تبدیلیوں کی روشنی میں اسلام کے تصورات اور جدید تصورات میں مطابقت کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم بحث متحدہ قومیت ہے۔ علماء نے اس ضمن میں قومیت کے جدید تصور اور جمہوریت میں رہتے ہوئے ہندوستان کا ایک ملک کے طور پر برقرار رہنا بہتر قرار دیا جبکہ مسلم لیگ کے علماء ورہنماؤں کا یہ مؤقف تھا کہ بطور مسلمان ایک اسلامی ریاست کی تشکیل بھی تو ہماری ذمہ داری ہے۔ شرعی ریاست بنانے کا مطالبہ بھی حالات، امکانات اور مصالح سے ماورا نہیں، اس کا فیصلہ ہمیں حالات، ماحول اور امکانات کا جائزہ لے کر کرنا ہوگا۔ ہمیں اس بحث کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے ان تبدیلیوں کو تاریخی عمل کے طور پر دیکھا ہے۔ اسلامی تہذیب وتاریخ جس طریقے سے آگے بڑھی ہے، اس کے چار ادوار انہوں نے بیان کئے ہیں۔ اس کا سیاسی اصول چاروں ادوار میں مختلف رہا ہے۔ پہلا دور عرب شہنشاہت کا ہے۔ اس کے بعد ترک ہیں، اس میں سیاسی عصبیت کا عرب اصول ختم ہوا اور آفاقیت پیدا ہوئی کہ دوسری قومیں بھی اسلامی تہذیب وتمدن اور حکومت کے لئے اپنا

کردار ادا کرسکتی ہیں۔ تیسرا دور اٹھارویں، انیسویں صدی کا ہے۔ چوتھا دور وہ جدوجہد کو قرار دیتے ہیں جس میں اسلامی تہذیب ایک قوم و خطے سے نکل کر عالمی دائرے میں آجاتی ہے۔ اس وقت تک عالمی سطح پر جو تبدیلیاں آچکی ہیں وہ بظاہر ناقابل تنسیخ ہیں، یہ تا حال قائم و مستحکم ہیں، اور تمام قومیں انہی کے مطابق اپنی اپنی قومی ترجیحات کا تعین کر رہی ہیں۔ تو مسلمانوں کو بھی اس سفر میں ان کے ساتھ رہنا ہوگا اور اپنی بقاء کے راستے نکالنے ہوں گے۔ ان حالات میں کس طرح اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں پر اللہ کے پیغام اور دین اسلام کے ابلاغ کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سے کیسے عہدہ براء ہوا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہم اسلام کے اخلاق و تہذیب کے تصور کو کیسے عام کر سکتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مذہبی ذہن موجودہ جمہوری اور قومی ریاست کے تصور کو قبول نہیں کرتا اور اس کے متبادل پر یقین رکھتا ہے، انہیں اس کے لئے بھی ایک فکری محنت کی ضرورت ہے، اور دوسرے طبقہ کو بھی غور و فکر کی ضرورت ہے جو حالات کے ساتھ جو امکانات عملاً موجود ہیں ان کے ساتھ جدوجہد پر یقین رکھتا ہے۔ دونوں گومگو اور غلط فہمی میں رہنے کے بجائے جدید دور میں سیاسی تصورات کے بارے میں اپنی فکر کو واضح کریں۔ عملاً جو امکانات اللہ پاک نے اپنی تکوین میں رکھے ہیں وہی ظہور ہوں گے۔

بین المسالک و مذاہب مکالمہ، مفاہمت اور آداب اختلاف

علامہ سید عقیل احمد انجم

صدر جمیعت علمائے پاکستان سندھ

جب ہم بین المسالک ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں تو اسے سمجھنے کے لئے بین المسالک اختلافات کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ رب کائنات نے دنیا کے اندر بڑا تنوع رکھا ہے اور اختلاف اس قدر کہ دنیا میں اگر پانچ ارب انسان ہیں تو کسی کا چہرہ دوسرے سے مماثلت نہیں رکھتا۔ کسی کے فنگر پرنٹس اور ذہنی سطحیں بھی ایک دوسرے سے مماثلت نہیں رکھتیں۔ یہ رنگا رنگی اور تنوع انسانوں کی آسانی کے لئے ہے۔

میر تقی میر کا ایک شعر یاد آ گیا۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں اور ہم بیزار بیٹھے ہیں

گویا ایک ہی چہرہ دیکھ دیکھ کر انسان تنگ آ جاتا ہے۔ گویا تنوع اور اختلاف ایک فطرت ہے۔ یہ لوگوں کے تعارف، پہچان اور آسانی کے لئے ہے۔ اسلامی احکامات میں جو تنوع نظر آتا ہے یہ لوگوں کی آسانی کے لئے ہے۔ اسلام نے بے لچک احکامات نازل نہیں کئے۔ میرا تعلق مسلک صوفیاء سے ہے۔ گذشتہ ایک پروگرام میں جب مجھے دیگر شرکاء کے ہمراہ تعارف کے لئے کہا گیا تو میں نے عرض کیا تھا کہ میرا مسلک اعتدال ہے۔ لوگوں نے مذاق کیا میں نے کہا تین دن گذرنے دیں، جب پروگرام کا اختتام ہوا تو تقریباً تمام شرکاء اس مسلک اعتدال سے متفق ہو چکے تھے۔ میں بھی انتہا پسندی کی بھٹی سے نکلا ہوں۔ جب میں کالج میں تھا تو اس وقت میں نے بھی مناظرے کی کتابیں وغیرہ پڑھ لی تھیں اور کالج کے صحن میں مناظرے کرتا رہتا تھا۔ بی ایس سی کرنے کے بعد میں جامعہ علیمیہ میں داخل ہوا اور اپنی استعداد کے مطابق علم دین حاصل کرنے کی کوشش کی۔

عزیزان محترم، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اختلافات کو تنازعات بننے سے روکیں۔ یہ اختلافات اہل علم کے کتابی اختلاف ہیں، جب یہ عوام میں پہنچتے ہیں تو تنازعات بن جاتے ہیں۔ میں نے جب تک امہات کتب کو نہیں پڑھا تھا تو ابتدائی علم کو ہی حد آخر سمجھتا تھا۔ ہمارے ہاں ایک اصلاحی تحریک ہے جب اس کا آغاز ہوا تو انہوں نے کہا کہ جب تک تمہارے پاؤں کی دس کی دس انگلیوں کا پیٹ زمین کے ساتھ نہیں لگے گا تمہاری نماز نہیں ہوگی۔ لیکن جب امہات کتب تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ کسی ایک بزرگ کا اجتہادی مسئلہ ہے۔ انہوں نے نماز میں خشوع وخضوع کے لئے اس بات پر زور دیا ہے۔ دوران نماز ٹخنوں سے شلوار نیچے ہونے کے لئے سخت تاکید ہے۔ اس ضروری مسئلے میں آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حوالے سے رخصت لے لیتے ہیں اور جو عمومی مسئلہ ہے اس پر کیوں شدت اختیار کرتے ہیں۔

اتنی نہ بڑھا پاکئ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

عزیزان محترم: اس بات کو قرآن میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ جھگڑا تب پیدا ہوتا ہے جب ہم اپنے عقیدے کی تعلیمات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تو یہ پابندی نہیں لگائی۔ سیدنا موسیٰ وسیدنا ہارونؑ ان دونوں کو جب خدائی کا دعویٰ کرنے والے ظالم حکمران فرعون کے پاس بھیجا تو فرمایا کہ اس سے ذرا نرم لہجے میں بات کرنا، شائد وہ نصیحت قبول کرلے، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دین کے علمبردار ہونے کے باوجود جب ہم دوسرے مسلمانوں کے سامنے اپنا مسلک بیان کرتے ہیں تو ہمارے منہ سے آگ اور شعلے نکلتے ہیں۔ جب اللہ رب العالمین ادعو سبیل ربک بالحکمہ کا حکم دیتے ہیں تو ہمیں اس ھدایت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ آج مارو اور مرجاؤ کا شور ہے۔ قاتل اور مقتول دونوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیوں مار رہے ہیں یا مارے جارہے ہیں۔ اس فتنے میں ہمارے علماء کا بھی ایک اضافی کردار ہے۔ جب تک ہم اپنی اصلاح نہیں کریں گے، معاملات درست نہیں ہونگے۔ آقا کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''راس الحکمۃ مخافۃ اللہ''

جب تک آپ کے اندر یہ بات پیدا نہیں ہوگی آپ خیر کی طرف نہیں جاسکتے۔ جب بھی تقرب خدا

اورخوف خدا آپ کے پیش نظر ہوگا تو معاملات درست ہوں گے، ان سے آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ جب میں بھی تقریر میں دو چار چٹکلے نہیں سناؤں گا، اشارتاً کنایتہً دوسرے مسلک پر طنز وتنقید نہیں کروں گا اس وقت تک لوگوں کو مزہ نہیں آئے گا، اگر لوگ محظوظ نہ ہوئے تو ان کی جانب سے قابل قدر مالی معاونت سے محروم ہو جاؤ نگا۔

یہ بات پیش نظر رکھیں دین اللہ کا ہے، ہمیں اللہ کے دین کی خدمت کرنی ہے اور اللہ ہی کو جوابدہ ہونا ہے۔ ہمیں معاشرے میں جو تکریم ملی ہے وہ اللہ کے دین کی وجہ سے ہے اس نے ہمیں عزت عطا کی ہے، لوگ ہماری خدمت دین کی وجہ سے کرتے ہیں لہذا دین کی عزت وآبرو کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے نہ کہ ہم اپنی حرکات اور رویوں سے اس کے وقار کو ٹھیس پہنچائیں۔ جب تک اپنی اصلاح خود نہیں کریں گے دوسرے ہمیں کیسے تبدیل کر سکتے ہیں۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس بات سے کتنی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے اکابرین مسائل فقہ میں اختلاف کے باوجود جب دوسری فقہ کے امام کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو اس وقت وہ اپنی فقہ چھوڑ کر اس امام کی اقتداء کرتے تھے۔ جب تک لوگ ایک دوسرے کے قریب نہیں آئیں گے اختلافات کم نہیں ہونگے۔ آپ کا آپس میں ملنا جلنا آپ کے درمیان دوستی وتعلق کو استوار کرے گا۔ اگر آپ سنگ دل نہیں ہیں تو آپ لوگ اس عمل سے بہت قریب آسکتے ہیں۔

علماء نے اختلاف کو پانچ درجوں میں تقسیم کیا ہے اور سب سے بلند درجہ کفر وایمان کا رکھا ہے لیکن ہم نے مسالک کے درمیان تمام اختلافات کو کفر وایمان کا مسئلہ بنالیا ہے۔ یہ تو مسلمان بمقابلہ کفار کا مسئلہ ہے ، دو کلمہ گو افراد کے درمیان نہیں۔ دوسرا درجہ حق و باطل اور اعتقادات کی تعبیر سے متعلق ہے، اس میں اہلسنت ، اہل تشیع، خوارج ومعتزلہ وغیرہ کے عقائد کی بحث ہے۔ علماء اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ترمذی شریف کی اس حدیث کے اندر جس میں تہتر فرقوں کا ذکر ہے اور ایک کو ناجی قرار دیا گیا ہے، دیگر بہتر فرقوں کو بھی حضور

اقدس ﷺ نے دین سے خارج قرار نہیں دیا بلکہ اپنے ہی دین کے فرقے قرار دیا ہے۔ تیسرا درجہ اختلاف بین المذاہب ہے، جس میں وہ فقہی اختلافات ہیں جو احناف، شوافع، حنابل، مالکیوں اور اہل ظواہر کے اندر موجود ہیں۔ پھر ان کے اندر بھی اولیٰ اور غیر اولیٰ کا اختلاف ہے کہ کسی ایک کی فقہ میں کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے۔ چوتھی گروہ بندی تعبیرات عقائد پر ہے۔ ہم ساڑھے چودہ سو سال کے بعد کے لوگ ہیں، ہماری علمی قابلیت زیادہ نہیں ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہؓ اور سیدنا عبداللہ ابن عباسؓ رؤیت باری تعالیٰ کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ ابن مسعودؓ اور سیدنا فاروق اعظمؓ کے درمیان کئی مسائل پر اختلاف تھا، انہوں نے اس اختلاف کو تنازعہ نہیں بنایا۔ سیدنا علیؓ کے دور میں فتنے عروج پر ہیں، ایک خوارج ہیں اور دوسری طرف امیر معاویہؓ کی قیادت میں خون عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والے ہیں، تیسری طرف خلیفہ برحق حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہیں۔ اس دوران جتنا بھی جنگ و جدال ہوا، دونوں طرف کے شہداء کی نماز جنازہ حضرت علیؓ پڑھاتے تھے۔ آپؓ نے ان کی تکفیر نہیں فرمائی، حالانکہ وہ لوگ جناب علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف لڑے۔ آج ہم کفر کا فتویٰ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں کرتے۔ اگر زبان سے فتویٰ نہ بھی دیں تو عملاً ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان اختلافات کے خاتمے کے لئے ہمیں قرآن پاک کی آیت، لا اکراہ فی الدین، کو اپنا لوگو بنانا چاہئے۔ یہ ہمارا سرنامہء کلام ہونا چاہئے۔ ہمیں دوسروں پر جبر اور اپنی بات مسلط کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔ ہم میں یہ برداشت ہونا چاہئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھیں۔

میں چونکہ مسلک صوفیاء یعنی اعتدال کی بات کرتا ہوں تو یہ کہوں گا کہ اللہ پاک نے ان مسالک کے ذریعے اپنے حبیب ﷺ کی اداؤں کو محفوظ کر لیا۔ اگر آپ ﷺ نے رفع یدین کیا، سینہ پر یا زیر ناف ہاتھ باندھے یا ہاتھ کھول کر نماز پڑھی، تو یہ ساری صورتیں کسی نہ کسی مسلک میں اختیار کی گئیں ہیں۔ آپ جب اپنے زبان و قلم کو استعمال کریں تو مثبت طور پر استعمال کریں۔ میں ان تمام علماء و بزرگوں کے لئے دعا گو ہوں جنہوں نے حضرت شاہ احمد نورانیؒ کی قیادت میں جیسے قاضی حسین احمد، مولانا سمیع الحقؒ اور مولانا فضل الرحمٰن، علامہ ساجد نقوی، علامہ ساجد میر شامل ہیں نے ایک ساتھ بیٹھ کر قوم کو ایک پیغام دیا۔ اگر یہ تمام ایک ساتھ بیٹھ سکتے ہیں، جلسوں میں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بلند کر سکتے ہیں تو ہم ملک کے مختلف حصوں میں

رہنے والے عام مسلمان کیوں ایک دوسرے سے دشمنی رکھیں گے۔ کیا ہم ان دیواروں کو توڑ نہیں سکتے ،او رفاصلوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہ ہم سب کے لئے ایک سوال ہے۔

ہماری جو بھی بنیادی تعلیم ہے اس میں تمام تر کاوش یہ ہوتی ہے کہ طالب علم کو اچھی انگریزی آجائے چاہے مضمون کوئی بھی ہو۔ سائنسی مضمون اختیار کرنے ہیں تو پہلے اسے مادری، پھر قومی اور پھر انگریزی زبان میں سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ اس تعلیمی نظام نے بہت زیادہ نقصانات کئے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں انہیں زبان نہیں پڑھائی جاتی کہ یہ اچھی انگریزی بولنے لگیں بلکہ انہیں ایک تو علم سکھایا جاتا ہے، دوسرے انہیں اچھا انسان بنایا جاتا ہے۔ مجھے کئی ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا وہ اپنے ملک کی زبان بولنے پر فخر کرتے ہیں ان کی دکانوں کے سائن بورڈ بھی ان کی اپنی زبان میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ جشن ریختہ بھی ہو تو اس کے لئے بھی گریٹ اردو فیسٹیول کا بورڈ لگایا جاتا ہے۔ یہ ہمارا احساس کمتری ہے۔ یہ احساس کمتری مدارس کے طالب علموں میں بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے ان میں وہ شائستگی، برداشت اور تہذیب پیدا نہیں ہوتی جس کی ہم ان سے توقع کرتے ہیں۔ خاندانی طور پر علم دین سے وابستہ علماء مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا شاہ احمد نورانی، مفتی محمد شفیع صاحب، حافظ محمد سلفی ایسے لوگ ہیں جن کی خدمت میں بیٹھ کر آپ مسلک نہیں سیکھیں گے بلکہ اخلاق و آداب، علم و رواداری اور شائستگی سیکھیں گے۔

بحیثیت مسلمان ہمیں حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا، ''خیر الناس من ینفع الناس'' لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو دوسرے لوگوں کے لئے فائدہ مند ہے۔ یہاں مومن یا مسلمان کی قدغن نہیں لگائی بلکہ انسان اور انسانیت کی بات ہوتی ہے، جبکہ ہم مومن اور کلمہ گو کے بارے میں یہ فتویٰ لگاتے ہیں کہ اس کو قتل کرو گے تو تمہیں جنت ملے گی۔ کیا نبی کریم ﷺ ان لوگوں سے راضی ہوں گے جنہوں نے جمعہ، نماز عید اور نماز جنازہ اجتماعات پر خودکش حملے کئے سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا۔ ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

ہمیں بدگمانیوں نے ایک دوسرے سے دور کیا ہے۔ فتنے، انتشار، گروہ بندی، مقابلے، تنازعات

اور تناؤ کے اس ماحول میں جب سازشیں، ریشہ دوانیاں اور ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنا اپنے عروج پر ہوں تو آپ حکمت ومصالحت کا راستہ اختیار کریں۔ یہی خدا خوفی اور تقویٰ کا تقاضا ہے۔ میں نے بھی ہمیشہ ذاتی طور پر تمام مسالک کے اکابر کی عزت کو پیش نظر رکھا ہے، کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے کہ کفار کے جھوٹے خداؤں کو بھی برا نہ کہو کیونکہ جواب میں وہ تمہارے سچے خدا کو بھی برا کہنا شروع کر دیں گے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن یہ بھاری پتھر ہے۔ جب آپ خطبہء جمعہ کے لئے جاتے ہیں تو اس طرح کی رواداری کی باتیں کرنا بھی بعض لوگوں کے لئے قابل وقبول نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی نرم باتیں برداشت نہیں کی جاتیں، ''کہ اکبر بھی خدا کا نام لیتا ہے اس زمانے میں''، وہ کہیں گے کہ یہ دوسرے مسلک کے لوگوں کے بارے میں نرمی سے بات کرتا ہے اور ان سے مل بیٹھ کر ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ اس کا تو مذہب اور مسلک خراب ہو گیا۔

عزیزان محترم: آپ تمام لوگوں کو خاص طور پر ان نوجوانوں کو جو دین کی طرف راغب ہونے کے بعد سخت گیر نیم ملا بن جاتے ہیں انہیں راہ اعتدال کی طرف لے کر آئیں یہ لوگ فتنہء دین بن جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے معاشرے میں زیادہ انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اختلاف چونکہ رحمت ہے اس لئے اسے آسانی اور صراحت کا ذریعہ بنائیں۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے بارے میں اچھا گمان نہیں رکھیں گے ہم انتہا پسند رہیں گے۔ نیک نیتی کے ساتھ اختلاف رائے بھی کیا جا سکتا ہے اور عصبیت سے بالاتر ہو کر نیک نیتی کے ساتھ اچھے نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ جو بالادستی کا تصور ہے کہ ایک دوسرے پر غالب آنا چاہئے یہ ایک باطل تصور ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی حیثیت کو سمجھ کر اسے برداشت کرنا چاہئے۔ کسی بھی مسلک کو جاننے کے لئے اس کے مخالفین کی کتابیں نہ پڑھیں، بلکہ آپ اسی مسلک کے علماء کی کتب کا مطالعہ کریں۔ آپ شہد کی مکھی بنیں جو پھولوں پر آ کر بیٹھتی ہے آپ گند کی مکھی نہ بنیں جو صرف گندگی پر آ کر بیٹھتی ہے۔ باہمی مکالمہ، احترام و باہمی رشتہ اخوت، دین کی بنیادی تعلیم کی پاسداری ہمیں پیش نظر رکھنی چاہیے۔ مخالفانہ کے بجائے مفاہمانہ اور مکالمانہ انداز اختیار کیا جائے۔ غلط صحبت اور مناظرانہ انداز سے فرقہ واریت زیادہ بڑھتی ہے۔

اہل علم کو سمجھنا چاہئے کہ ہم مناظروں کی سیاست سے دور رہیں اور کسی کے آلہ کار نہ بنیں۔ مکالمہ کے لئے سابقہ مفروضوں کو ترک کرنا ضروری ہے۔ مکالمے میں شائستگی اور نتیجہ خیزی اور مقصدیت ہونی

چاہئے۔آپ درسی کتب ضرور پڑھائیں لیکن طالب علموں میں شائستگی اور اخلاق بھی پیدا کریں۔ایک بار ایک صاحب مجھ سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے کہ یہ جو بریلویت ہے یہ ہندوازم اور اسلام کا ملغوبہ ہے۔ان کے ہاں کھڑے خدا ہیں اور آپ کے ہاں لیٹے ہوئے ہیں۔میں نے کہا کہ میں آپ سے کوئی بحث نہیں کروں گا۔میں کوشش کروں گا کہ آپ کی غلط فہمیاں دور کروں۔آپ بھی غصے میں نہ آئیں میں بھی کوشش کروں گا کہ غصے میں نہ آؤں۔تین دن ایک دوست کے گھر ہماری گفتگو جاری رہی اس کے نتیجے میں ہم نے ایک دوسرے کا مسلک تو اختیار نہیں کیا لیکن ہم پکے دوست بن گئے۔یہ شائستہ لہجوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔آج ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ آج جو صاحبان منبر ہیں ان کی مذکر ومونث، واحد جمع تک ٹھیک نہیں ہوتیں ان کا تو یہی عالم ہوگا۔

گرے گا جس طرف قیامتیں ہی ڈھائے گا

عزیزان محترم: مکالمہ اختلافات کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لیکن یہ مکالمہ پہلے سے قائم شدہ تصورات کی بنیاد پر نہ ہو اس کی بنیادیں علمی ہونی چاہئے۔اسلام کی تاریخ دیکھیں جو بھی اصلاح کے لئے کھڑا ہوا اس نے ایک نیا فرقہ پیدا کیا۔اب اصلاح کے نام پر ہم کوئی نیا مسلک پیش کرنے کے لئے اکٹھے نہیں ہوئے۔ہم یہی گذارش کرتے ہیں کہ آپ سب اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے باہم شائستگی اور رواداری کو فروغ دیں اور ایک دوسرے کو برداشت کریں۔آئیں ہم سب اپنے اپنے اندر کے ان بتوں کو توڑ ڈالیں اور آپ ﷺ کی عطا کردہ محبت، رواداری اور شائستگی کی ان تعلیمات کو عام کریں جنہیں ہم سب جانتے ضرور ہیں مگر ظاہر نہیں کرتے۔ایک دوسرے کو منفی نگاہ سے نہ دیکھیں، بلکہ محبت اور رواداری کو فروغ دیں کیونکہ کوئی بھی مسلک جیسے شیعہ، بریلوی، دیوبندی، اہلحدیث ایک دوسرے کو ختم نہیں کر سکتے۔ہم یہ مثبت سوچ رکھیں کہ یہ مسالک آپ ﷺ کی تمام محبوب اداؤں کے وارث ہیں۔

میں نے آپ کی بہت سمع خراشی کی، کچھ باتیں ناگوار بھی گزری ہونگی، مجھے اپنی حماقتوں کا ادراک ہے اور آپ کے سامنے اس کا اقرار کرتا ہوں لیکن آپ کی خدمت میں یہ ضرور عرض کروں گا۔آپ کے لئے پیغام بھی ہے۔

حق نے کی ہیں دہری دہری خدمتیں تیرے سپرد
خود تڑپنا ہی نہیں اوروں کو تڑپانا بھی ہے
خود سراپا نور بن جانے کب چلتا ہے کام
تجھ کو اس ظلمت کدے میں نور پھیلانا بھی ہے

مفتی شہاب نعمت

اسسٹنٹ پروفیسر اسلامک سٹڈیز

آج کی ہماری نشست کا موضوع ہے جمہوری اصولوں کے تناظر میں تنازعات کا حل اور بین المسالک و مذاہب میں مکالمہ۔ ہمارا مرکزی موضوع تنازعات کا حل ہے، یعنی کہ تنازعہ کیا ہے اس کو کیسے سمجھا جائے، یہ کیوں پیدا ہوتا ہے، یہ اپنی ذات میں کیا ہے، اس کا حل کیسے ممکن ہے۔ جہاں مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں وہاں تنازعہ پیدا ہوتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے درمیان کسی تعلق کے باعث تنازعہ پیدا ہوسکتا ہے۔ ایک فرد یا گروہ اپنا مفاد اسی صورت میں پورا کرسکتا ہے جب ان کی دانست میں دوسرے گروہ کو نقصان اٹھانا پڑے یہی تنازعہ کہلائے گا۔ تعلقات اور تنازعات کی نوعیت اور گروہوں کے مفادات ہر مقام پر مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس کو حل کرنے صورت یہ ہے کہ تنازعہ کے ضمن میں دونوں افراد یا گروہوں کے ذہن سے یہ بات نکال دی جائے کہ محض دوسرے کا نقصان ہی اس کے مفادات کے تحفظ کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ تنازعہ کے حل کے اور بھی طریقے موجود ہیں، انہیں پر امن رکھ کر ہی تنازعہ کا حل ممکن ہے۔

سورہ حجرات کی جو آیات تلاوت کی گئی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب دو گروہ یا افراد آپس میں لڑ رہے ہوں تو تیسرے فریق کی ذمہ داری اور فرض ہے کہ ان کے درمیان صلح کروائے، اور صلح میں عدل وانصاف سے کام لو کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں۔ یہ بھی حکم دیا گیا کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اگر تیسرے فریق کو مسلمانوں کے درمیان صلح کروانے کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے تو وہ یہ سمجھے کہ وہ دو بھائیوں کی آپس میں صلح کروا رہا ہے۔ دو بھائیوں کے تنازعہ کو ختم کرنے

کے لئے ہوسکتا ہے آپ کو ان کے ساتھ وابستہ مفادات کو بھی نقصان پہنچے، لیکن اللہ تعالیٰ یہ سوال کریں گے کہ آپ نے انصاف کو مدنظر رکھا یا اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا۔

ایک اور آیت ''واعتصمو بحبل اللہ جمیعا'' میں بھی اتفاق اور اتحاد پر زور دیا گیا ہے۔ ایک اور جگہ بھی فرمایا گیا ''اصلحو خیر'' بے شک صلح میں خیر ہے۔ ایک روایت کے مطابق شب قدر سے امت کو آگاہ کیا جا رہا تھا لیکن محض دو آدمیوں کی باہم لڑائی اور تنازعہ کی وجہ سے اس رات کو پوشیدہ کر دیا گیا۔ اس وقت عصری مدارس اور جامعات میں ایک مضمون پڑھایا جاتا ہے یعنی تنازعات کو کیسے حل کیا جائے۔ لہذا کاروبار ہو یا میاں بیوی کے معاملات ہوں، ہر جگہ صلح کے لئے کوشش کی جانی چاہئے۔ سیاسی سیاسی تنازعات اور جھگڑے ذاتیات میں بدل گئے ہیں، نظریے سے ذاتیات پر اترنا حماقت ہے لہذا اس حد تک نہیں جانا چاہئے۔ جب ہم غور وفکر نہیں کرتے اور ایک دوسرے کا مؤقف نہیں سننا چاہتے، مکالمہ نہیں کرنا چاہتے، تو تنازعہ تصادم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مباحثہ اور مکالمہ میں یہ فرق ہے کہ مباحثہ میں ایک فریق غالب آنے کی کوشش کرتا ہے، جبکہ مکالمہ میں دونوں کو ایک دوسرے کی بات سننا پڑتی ہے اور ان باتوں پر غور وفکر کا موقع ملتا ہے۔ مکالمہ میں یا درس گاہ میں جب کسی موضوع پر گفتگو ہوتی ہے تو مختلف آراء کا اظہار ہوتا ہے تو ہر ایک فرد یا طالب علم اپنی اپنی رائے کا اظہار اپنے اپنے انداز میں اپنی اپنی فکر اور ذہن کے مطابق کرتے ہیں۔ اس میں تنازعہ نہیں پیدا ہونا چاہئے، بلکہ ایک موضوع میں بہت سی آراء تشکیل پاتی ہیں تو موضوع زیادہ واضح پہلوؤں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

آپ ﷺ کے اصحاب میں بھی اختلاف رائے رہا لیکن باہمی خیر خواہی اور ایک دوسرے کے احترام وعزت میں کبھی کمی نہیں آنے دی، کیونکہ وہ تقویٰ کے ایسے درجے پر تھے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو چکے تھے۔ ہمیں بھی ان کی راہ اختیار کرنا ہوگی، ہمیں بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ پہلوان وہ ہے جو دوسرے فریق کو نہیں بلکہ اپنے غصہ کو پچھاڑ دے، اس پر قابو پالے۔ تنازعہ بعض اوقات تاریخی تبدیلی اور ترقی کے مواقع بھی پیدا کرتا ہے، اگر غور وفکر کے ساتھ ان تنازعات کا حل تلاش کیا جائے۔ فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کے ذریعے آپ ﷺ نے جب سابقہ تنازعات کو ختم کر دیا تو مکہ کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے جو آپ ﷺ کی جان کے دشمن تھے۔ ایک فیصلے کے کتنے بڑے

نتائج برآمد ہوئے۔اس سے یہ بات سمجھنی چاہئے کہ ہم وقتی نقصان کو برادشت کر کے تنازعہ ختم کرنے کی کوشش کریں گے تو بعد میں اس کے کثیر فوائد وثمرات حاصل ہوں گے۔

امن کی دو قسمیں ہیں مثبت امن اور منفی امن، مثبت امن تو برادرانہ تعلقات ہیں، لیکن منفی امن یہ ہے کہ بظاہر امن ہو لیکن دلوں میں نفرت باقی ہے۔تنازع کے حل میں تین جزو ہیں: فریقین، تعلق اور مسئلہ۔ فریقین اول، ثانوی اور بالواسطہ، تین درجے کے ہیں۔اس کی مثال اگر میاں بیوی ہیں تو وہ فریق اول ہی، اولاد ثانوی ہے، رشتہ دار اور اہل محلّہ یا باقی خاندان بالواسطہ فریق ہوں گے۔تعلق میں مفاد، رشتہ اور نظریہ آتے ہیں۔مسئلہ تنازعہ فیہ ہے جس پر مفادات کا ٹکراؤ ہے۔یہ توقعات بھی ہوسکتی ہے، نظریات کا اختلاف بھی ہے اور مالی معاملات بھی تنازعے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔طاقت واختیار، اقدار وافکار، رویوں کا اختلاف یہ سب تنازعات کے سبب ہو سکتے ہیں۔لہذا تنازعہ کے حل کے لئے ان تمام کا جائزہ لینے اور انہیں سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تنازعہ کے کردار میں کچھ اسے بڑھکانے والے، کچھ خاموش تماشائی اور کچھ سلجھانے والے ہوتے ہیں، تو علماء کا کردار تیسرا ہونا چاہئے۔ ہر جگہ اور ہر سطح پر صلح کار کا کردار ادا کرنا ان کا فرض ہے۔اس کے لئے قانون کی مدد بھی کی جاسکتی ہے۔فریقین کی رائے بدلنے کے لئے انہیں قائل کیا جا سکتا ہے اور مکالمہ کے ذریعے ان کے اختلافات کو دور کرنے کی کاوشیں اور اس کا مستقبل سدباب کرنے کی کوشش کی بھی اس میں شامل ہے۔

محمد ندیم ثانی

ارتقاء فاؤنڈیشن کراچی

سیکھنا سکھانا ایک رجحان ہے جو بہت مشکل ہوتا ہے، کیونکہ ہر شخص کے اپنے اپنے خیالات و نظریات ہوتے ہیں اور اس کے لئے ان کو نظر انداز کر کے نئی جہتوں پر غور کرنا یا سیکھنا ایک مشکل عمل ہے۔ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ سے آ کر عرض کیا کہ ایک شخص آپ کی نقل اتارتا ہے تو آپ ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ وہ

جنت میں جائے گا۔ اگر ہم آپ ﷺ کی سنت پر عمل کریں تو وہ عبادت ہوگی۔

جمہوری اصولوں کے تناظر میں تنازعات کا حل ایک بڑا موضوع ہے۔ ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو ایک طبقے یا معاشرے سے لے کر ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بہت بڑے بڑے تنازعات نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ابھی تک حل نہیں ہوئے۔ دنیا میں 9 سے 10 قسم کی شخصیات پائی جاتی ہیں، لیکن عمومی طور پر انہیں دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، مثبت اور منفی۔ ہمیں منفی نشان کو دیکھنا چاہیے، اس کو پکڑنا چاہیے تاکہ تنازعہ کی نہایت معمولی وجہ کے خاتمے تک پہنچ سکیں۔

تنازعہ کیا ہوتا ہے اور اس کے آداب کیا ہیں۔ تنازعہ دو افراد، گروہوں یا جماعت کے درمیان ہو سکتا ہے جن کے مفادات باہم ٹکرانے کی وجہ سے تنازعہ جنم لیتا ہے۔ (سورۃ انفال کی آیت نمبر 40 ہے) ہم انسان زمین پر اللہ کا کنبہ ہیں، اللہ اور اس کے رسول کے احکامات پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ کمزور ہو جاؤ گے۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ آپس میں مصافحہ کرو، اس سے غصہ اور کینہ جاتا رہے گا۔ آپس میں تحائف کا تبادلہ کرو اس سے محبت بڑھے گے۔ اگر ہم بڑے پس منظر میں دیکھیں، اور صرف اس ایک آیت اور حدیث پر عمل شروع کریں گے تو معاشرے کے بڑے بڑے مسائل ختم ہو جائیں گے۔

آپ تمام حضرات اپنے اپنے ادارے، مسجد یا مدرسے کے اندر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کے لئے مسائل یا تنازعات کو دیکھنا اور ان کا حل پیش کرنا مشکل نہیں ہوتا، یعنی عوام کے روزمرہ کے معاملات و مسائل کی بات ہو رہی ہے۔ آپ نے کتنے ایسے مسائل اور تنازعات حل کئے ہوں گے، جیسا کہ میں نے بہت ساری شادیاں کروائی ہیں اور طلاقیں بھی۔ کوئی بھی گھر یا باہمی رشتہ ہو، حتیٰ کہ ماں بیٹے کے درمیان بھی تنازعات ہو سکتے ہیں۔ ہمارے مرشد نے ایک بار فرمایا کہ لوگوں کے ہاں خوشیاں زیادہ اور غم کم ہیں لیکن غموں کا واویلا زیادہ ہے۔ ابھی مسالک اور مذاہب کی بات تو بڑی سطح کی ہے اگر ہم اپنے اپنے خاندانوں کو دیکھیں تو ان کے درمیان کئی کئی تنازعات ہوتے ہیں جن کا حل بھی ہوتا رہتا ہے۔ آپ حضرات کی بھی کئی مثالیں ہوگی۔

تنازع کے کئی محرکات اور کئی فائدہ مند ہوتے ہیں۔ بطور مسلمان ہم قسم اور قرآن لیکر سچ کو جھوٹ اور

جھوٹ کو سچ میں بدل دیتے ہیں۔ اپنے اپنے مفادات اور غلط فہمیاں کسی بھی تنازع کی بنیادوں میں موجود ہوتے ہیں لیکن نظر نہیں آرہے ہوتے۔ ہمارے ایک باس نے صبر کی اہمیت کے حوالے سے ایک اشارہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ دوسروں سے معاملات طے کرنے میں صبر و تحمل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ مثلاً اگر کوئی آپ سے ای میل میں سخت بات کر رہا ہے، تو آپ جواب ضرور لکھ لیں اس کو بھیجیں نہیں۔ آپ دوسرے دن دوبارہ پڑھ کر اس کو بھیجیں، لہذا اب بہت مرتبہ ایسا ہوا کہ پہلا لکھا ہوا مکمل طور پر بدلنا پڑا۔ اسی طرح ایک دوست جنہوں نے قرآن کو بغور پڑھا، ایک معاملہ میں بتانے لگے کہ جب ظالموں سے تمہارا سامنا ہو تو قرآن میں اس کے لئے یہ رہنمائی ہے کہ ان کے سامنے حکمت عملی کے ساتھ کھڑے ہوں، مقابلے کے لئے ایک دم سامنے نہیں آنا چاہیے۔

تنازع کے حل میں ثالثی کردار کے چند نمایاں اصول ہیں۔ ان کا ایک کردار ہوتا ہے وہ غیر مشروط ہوتا ہے۔ اس کردار کا کسی سے کوئی مفاد وابستہ نہیں ہوتا۔ ثالث کو غیر جانبدار رہنا پڑتا ہے، دوسرا یہ کہ وہ معاملات کی گہرائی کو سمجھتا ہو اور کسی سے مرعوب نہ ہوتا ہو اور نہ کسی کی سازش کا شکار ہو۔

بنیادی انسانی حقوق

مفتی عبدالرحمان

مدرس جامعه عروة الوثقیٰ ، لاہور

موجودہ پرفتن دور میں جملہ مکتب فکر کے علماء کے باہم گفتگو کے لئے اس طرح جمع ہونے کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔آج کا میرا موضوع بہت اہم ہے۔انسانی حقوق یا حقوق العباد: پاکستان کے آئین اور اسلام کی روشنی میں۔آج تک ہم یہی سنتے آرہے ہیں کہ حقوق العباد 80% ہیں اور 20% حقوق اللہ ہیں۔امت مسلمہ نے اسی 20% حقوق اللہ کو بڑا دل سے مانا اور جانا اور امت کا اکثر حصہ اسی پر رہا، بقول ایک بزرگ مولانا یوسف صاحبؒ [ہم سب لوگ عبادات کے ذریعے دین میں داخل ہوتے ہیں اور معاملات کے ذریعے دین سے نکل جاتے ہیں]۔میں علمائے کرام کے سامنے ایک نکتہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو 20% حقوق اللہ ہیں ان کے اندر بھی حقوق العباد پوشیدہ ہیں،یعنی ہمارا دین 100% حقوق العباد ہی ہے۔عبادات میں ہم اگر روزے کو دیکھیں تو اللہ تعالیٰ کو آپ کے بھوکا رہنے کی ضرورت نہیں،روزے کی روح یہ ہے کہ ہم اس احساس کا ادراک کرسکیں کہ جن لوگوں کے پاس کھانا نہیں ہے یا کم ہے وہ کیا احساسات رکھتے ہیں اور کیسے ہم بھوک کا احساس کر کے معاشرے یا لوگوں میں بھوک کے فرق کو ختم کر سکتے ہیں۔ایک بزرگ مولانا الیاس صاحبؒ سخت گرمی میں علمائے کرام کو پہاڑ پر لے کر گئے ،جب پیاس بہت زیادہ ہوگئی تو کہنے لگے اب مجھے طائف کا قصہ سنائیں،یعنی وہ احساس کی کیفیت ان میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔مطلب یہ کہ روزہ ایک احساس کا نام ہے۔

نماز میں جہاں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے وہاں والرکعوا مع الراکعین کہا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا قرب اکیلے رہ کر بھی حاصل کر سکتے ہیں،لیکن دوسروں کے ساتھ روزانہ پانچ وقت میل جول اور تعلق بھی

انسانی حقوق یا حقوق العباد میں شامل ہے، کیونکہ میل جول سے ہی ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی، ایک دوسرے کے حقوق کا احساس اور ان کی ادائیگی ممکن ہے جیسے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص مسلمان نہیں جس کا ہمسایہ بھوکا سوئے اور وہ پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔ تو یہ حالات سے آگاہی آپس میں لگاتار میل جول سے ہی ممکن ہوگی جو روزانہ پانچ وقت مسجد میں ملنے جلنے سے میسر آئے گی۔ اب زکواۃ ہے، دنیا کے تمام مسلمان زکواۃ مکمل طور پر ادا کرنا شروع کر دیں اور سود کا نظام ختم ہو جائے تو پوری دنیا سے غربت ختم ہو جائے یہ بھی حقوق العباد کی بات ہے۔ جہاد کا تصور دوسروں کی مدد، اپنا دفاع بھی

حقوق العباد کا حصہ ہے۔ حج کو دیکھیں، پوری دنیا کے مسلمان ہر سال اکھٹے ہوتے ہیں اور غور کرتے ہیں۔ پوری دنیا کے حالات کے تقاضے کیا ہیں اور ہم کہاں کھڑے ہیں۔ مسجد انسانوں کا کمیونٹی سنٹر ہے صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام مذاہب کے افراد کے لئے مسائل کے حل کا ذریعہ ہوسکتا ہے، یہ انسانی حقوق کا مرکز ہے۔ مگر ہم ان مراکز اور مدارس کو انسانی حقوق کا مرکز بنانے کے بجائے ذاتی اغراض کی بنیاد پر چلا رہے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے عبادات کے اندر بھی حقوق العباد کی اس روح کو سمجھا ہی نہیں، نہ ہی بطور انسان یا مسلمان ایک دوسرے کا احساس پیدا کرنے یا اجاگر کرنی کی کوشش کی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ لوگوں کو بشارت دو، متنفر نہ کرو۔ بجائے ہم خوشخبریاں دوسروں تک پہنچانے کے نفرتیں پھیلا رہے ہیں۔ آسانیاں پیدا کرنے اور پھیلانے کا حکم دیا گیا ہم اس کے برعکس کر رہے ہیں۔ ہمیں بطور طبقہ علماء خاص طور سے اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آج مسلمان ایسی زندگی گزار رہے ہیں لگتا ہے کہ انہوں نے خدا کو جواب ہی نہیں دینا، قرآن میں جہاں کہا گیا کہ وہ یتیم کو دھکے دیتے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے، ہم مسلمان اسی بات پر چل رہے ہیں۔

شرکائے گفتگو

☆ **پروفیسر ڈاکٹر سید جعفر احمد**، سابق ڈائریکٹر پاکستان سٹڈی سینٹر جامعہ کراچی

☆ **ڈاکٹر فاروق ستار**، سینئر پارلیمینٹیرین وسیاسی رہنما

☆ **میاں جاوید لطیف**، رہنما پاکستان مسلم لیگ وممبر قومی اسمبلی

☆ **ملک سکندر ایڈووکیٹ**، قائد حزب اختلاف، رہنما جمعیت علمائے اسلام بلوچستان

☆ **علامہ عبدالحق ہاشمی**، امیر جماعت اسلامی بلوچستان

☆ **علامہ سید عقیل احمد انجم**، صدر جمعیت علمائے پاکستان سندھ

☆ **طاہر حمید تنولی**، ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی لاہور

☆ **علامہ عمار خان ناصر**، وائس پرنسپل الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ

☆ **ڈاکٹر حافظ عبدالغنی**، ایسوسی ایٹ پروفیسر، ایف سی کالج لاہور

☆ **ڈاکٹر سعید احمد سعیدی**، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی

☆ **مولانا عبدالقدوس ساسولی**، مرکزی رہنما جمعیت علمائے پاکستان، بلوچستان

☆ **علامہ سید احمد یوسف بنوری**، مدرس جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی

☆ **راحت ملک**، سماجی رہنما ورائٹر

☆ **مفتی ثناء اللہ**، ایم فل۔ اسٹنٹ پروفیسر اسلامک سٹڈیز، بی یو آئی ٹی ایم ایس، فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

☆ **شہزادہ ذوالفقار**، سینئر صحافی، بلوچستان

☆ **رانا محمد آصف**، سینئر صحافی، کراچی

☆ **ڈاکٹر عمیر صدیقی صاحب**، اسٹنٹ پروفیسر اسلامک سٹڈیز جامعہ کراچی

☆ **مفتی شہاب نعمت**، اسسٹنٹ پروفیسر اسلامک سٹڈیز جامعہ بلوچستان

☆ **محمد ندیم ثانی**، ڈائریکٹر ارتقاء فاؤنڈیشن کراچی

☆ **مفتی عبدالرحمان**، مدرس جامعہ عروۃ الوثقیٰ، لاہور